دکنی تذکرے

پونہ یونیورسٹی سے پی۔ایچ۔ڈی کے لیے سال ۱۹۸۲ء میں منظور شدہ مقالہ

ڈاکٹر مجید بیدار

(ایم۔اے۔ایم۔فل۔پی ایچ ڈی)

نگران :۔

ڈاکٹر اے ین شیخ امانت

پروفیسر انچارج، پوسٹ گریجویٹ اسٹڈیز اِن اُردو، پونہ یونی ورسٹی۔پونے

ب

پورا نام: سید عبدالمجید

قلمی نام: مجید بیدار

قابلیت: ایم ۔ اے ۔ ایم ۔ فل ۔ پی ایچ ڈی

پیشہ: لکچرار شعبہ اُردو مولانا آزاد کالج اورنگ آباد ۔ مہاراشٹر

پیدائش: بمقام پرگی ۱۶ رمئی ۱۹۵۲ء

سکونت: نواب پورہ اورنگ آباد ۔ 431001



پہلی اشاعت: دسمبر ۱۹۸۵ء

تعداد: ایک ہزار

مقام طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس حیدرآباد

کتابت: محمد غالب

ناشر: مکتبہ شاداب

قیمت: ۶۰ (ساٹھ) روپے

(مہاراشٹرا اردو اکاڈمی کی جزوی امداد سے شائع کردہ)

۵

فہرست

انتساب

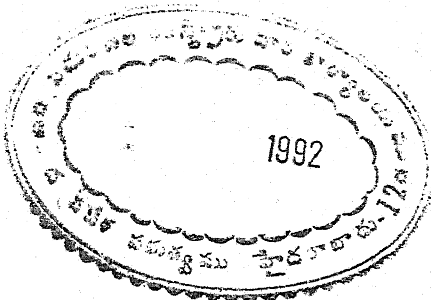
والدہ ماجدہ

حضرت سیدہ محمودہ بیگم صاحبہ

کی خدمت میں

جن کی مادرانہ شفقت نے مجھے کندن بنا دیا اور جن کی بے نور آنکھیں میری ترقی کی معراج کو دیکھنے کے لیے خدا سے بینائی طلب کرتی ہوئی بے چین نظر آتی ہیں ۔

ڈاکٹر مجید بیدار



ہدیۂ تشکر و سپاس گذاری

- ڈاکٹر سیّدہ جعفر
- ڈاکٹر نظام الدین گوریکر
- اختر الزماں ناصر
- ڈاکٹر مظہر محی الدین
- اطہر علی اسد
- یسین شریف
- سید اصغر حسین
- ممتاز جہاں صدیقی
- محمد قمر الدین صابری ایڈیٹر شاداب
- ریاض شیخ

مصنّف کی دیگر تصانیف

○ خونی جادوگر — مطبوعہ سال سنہ ۱۹۶۶ء

○ صوتی درس — ″ سنہ ۱۹۷۲ء

○ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کی ادبی خدمات — ″ سنہ ۱۹۸۰ء
آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی سے انعام یافتہ)

○ اردو سوانحی لغت — زیر طبع

○ اردو کتب انسائیکلوپیڈیا: زیر ترتیب

○ اردو ادب خزینۂ معلومات: ″

مقدمہ

ڈاکٹر مجید بیدار کی کتاب "دکنی تذکرے" ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے ۔ انھوں نے اپنے مقالے کے لیے ایک ایسے موضوع کا انتخاب کیا ہے جس کی طرف محققین نے بہت کم توجہ کی ہے اور اس اعتبار سے ڈاکٹر مجید بیدار یقیناً قابل مبارکباد ہیں۔ ڈاکٹر بیدار نے "تحفۃ الشعراء" اور "گلشن گفتار" سے لے کر "عالمگیری" اور آصفی دور تک تمام تذکروں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

پہلے باب میں مصنف نے تذکرے کے فن سے بحث کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ تذکرہ "تالیف" کی حیثیت رکھتا ہے۔ مقالے کے اس باب سے پتہ چلتا ہے کہ دوسروں کے خیالات اور ان کے اقتباسات نقل کرنے پر اکتفا نہیں کی ہے بلکہ ادبی مسائل پر خود غور و خوض کرکے نتائج اخذ کیے ہیں۔ دوسرے باب میں تذکروں سے قریبی تعلق رکھنے والی تحریروں مثلاً روزنامچہ، سوانح حیات، سفرنامہ، یادداشت اور خودنوشت وغیرہ کی ادبی نوعیت سے مدلل بحث کرتے ہوئے تذکرہ نگاری کی اہمیت اجاگر کی گئی ہے۔ تیسرے باب میں بڑے سلیقے کے ساتھ تذکروں کی گروہ بندی کی گئی ہے اور "انسائیکلوپیڈیائی" اور "صنفی" کی اصطلاحوں کی مدد سے بھی تذکروں کی درجہ بندی کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے بعد چوتھے باب میں ڈاکٹر مجید بیدار نے "عالمگیری" اور "آصف جاہی" دور کے تذکروں کی تاریخی اور ادبی

اہمیت پر بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ روشنی ڈالی ہے اور ان تذکروں کی منفرد خصوصیات کا جائزہ لیا ہے۔ پانچواں باب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس میں تذکروں کی مختلف اقسام کے موضوعات کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کے ذخیرۂ معلومات پر جس انداز سے بحث کی ہے اس سے مصنف کی ادبی بصیرت اور ذکاوت کا اندازہ ہوتا ہے۔ چھٹا باب اس لیے اہم ہے کہ اس میں دکنی تذکروں کے محاسن و معائب پر مختلف عنوانات کے تحت تبصرہ کیا گیا ہے۔ جس سے دکنی تذکروں کی ادبی اور تاریخی اہمیت واضح ہوتی ہے اور دکنی تذکروں کی منفرد خصوصیات کا پتہ چلتا ہے۔

مقالے کے آخری باب میں غیر مطبوعہ دکنی تذکروں پر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔ اس باب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر مجید بیدار میں تحقیق و تنقید کی اچھی صلاحیتیں موجود ہیں اور وہ تحقیق و تنقید دونوں سے بخوبی آشنا ہیں۔ کتاب کے آخر میں تذکروں کی جو فہرست پیش کی گئی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ ڈاکٹر مجید بیدار نے کس محنت، توجہ اور ادبی لگن کے ساتھ یہ مقالہ سپردِ قلم کیا ہے اور اس مقالے کی تیاری میں وسیع مطالعے، دیدہ ریزی، ادبی خلوص اور محنت و کاوش کا کتنا دخل ہے۔ مجھے امید ہے کہ ادبی حلقوں میں ڈاکٹر مجید بیدار کی اس کتاب کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔

پروفیسر سیدہ جعفر
صدر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی

۱۴ نومبر ۱۹۸۵ء

پیش لفظ

دکن کا علاقہ اس اعتبار سے کافی زرخیز رہا ہے کہ یہاں پر فنونِ لطیفہ کے فروغ کے لیے شاہی اور عوامی سطح پر جد و جہد کی گئی۔ فنون لطیفہ کی دیگر شاخوں میں شاعری اور ادب یہ ایسے وسیلے ہیں جنہیں دکن میں خاص مرتبہ دیا گیا اور سب سے پہلے اسی علاقہ سے ایک نئی زبان کی نشو و نما کے لیے سازگار ماحول پیدا کیا گیا جو ابتدا میں دکنی کہلائی اور دورِ حاضر میں ساری دنیا اسے "اُردو" کے نام سے جانتی ہے۔ اسی اُردو کے ابتدائی نمونے دکن کی سرزمین سے وابستہ ہیں اور اُردو کا قدیم دور دکن سے رابطہ جوڑے ہوئے ہے۔

دکن میں نثر و نظم دونوں کا شہرہ رہا۔ دورِ حاضر کی تحقیقات سے یہ ثبوت مل چکا ہے کہ سب سے پہلے اردو نثر و نظم کا آغاز دکن ہی سے ہوا۔ اس خصوص میں مختلف تحقیقی مقالے، تنقیدی مضامین اور مقدمات لکھے جا چکے ہیں۔ لیکن بیشتر کا تعلق نظم سے ہے۔ بہت کم محققوں نے "دکنی نثر" کی جانب توجہ کی، اگرچہ چند محققین نے اس جانب غور بھی کیا تو فنی طور پر مواد کی فراہمی پر توجہ نہیں کی گئی جس کا نتیجہ یہ رہا کہ دکنی نثر پر تحقیق کا کام اس بلندی کو چھو نہ سکا۔ جس کی اساس پر نظم و نثر پر تحقیق کے کام میں ہمسری پیدا ہو سکتی تھی۔ اس کے علاوہ دکن میں تحریر کردہ نثر کی فنی طور پر تقسیم کی جانب بھی بہت

کم توجہ دی گئی۔ ان بے ضابطگیوں کو دیکھنے کے بعد دکن سے وابستگی اور دکنی کے طالب علم ہونے کی وجہ سے "دکنی نثر" کی پامالی دیکھی نہ گئی اور مزاج ....۔ اردو ادب کی سب سے قدیم صنف نثر "تذکرہ" پر کام کرنے کی جانب راغب ہوا۔ فن تذکرہ پر تحقیقی مقالے اور مواد پر جب نظر کی تو اندازہ ہوا کہ اس عنوان پر دو اہم کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ تب ذہن اس جانب مائل ہوا کہ "دکنی تذکروں" پر تحقیق کی جانی چاہیے کیونکہ موجودہ دور میں تحقیق کے لیے تمام تر مواقع دستیاب ہونے کے باوجود محققین نے صرف دکن کے مذہبی رسالوں ہی کو دکنی نثر کا پیش رو مانا ہے جبکہ کئی تذکرے اس دور کی یادگار ہیں۔ چنانچہ اس عنوان پر مطالعہ کے دوران ایسے نادر انکشافات ہوئے جن کو ایک مبسوط کتاب کی شکل دینا ضروری تھا۔ اس لیے اس تحقیقی مقالے کو فن، دور، یادگار اور انفرادیت جیسے عنوانات سے آراستہ کیا گیا ہے۔ تذکرہ کا فن اور اقسام سے بحث کرتے ہوئے اس کے عہد کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ دکن میں تحریر کردہ ایسے منفرد تذکروں کا جائزہ بھی اس مقالہ میں شامل ہے جو ہر لحاظ سے جدت پسندی کے علمبردار ہیں۔ شاید دکن ہی پہلا مسکن ہے جہاں تذکرہ نگاری کے فن میں ہیئت، انداز اور مواد کے نئے نئے تجربے کیے گئے جس کی بنیاد پر "دکنی تذکرے" اردو ادب میں منفرد حیثیت کے حامل قرار دیے گئے۔

دکنی شکار ناموں، مذہبی قصوں، داستانوں، پند و نصائح، سیرۃ مناقب، نور ناموں اور معراج ناموں پر تحقیقی کام ہو چکا ہے۔ لیکن کسی محقق نے دکنی تذکروں پر تحقیقی کام نہیں کیا۔ قدیم کتبے، ملفوظات اور نسخہ جات کو اکٹھا کر کے ان پر تحقیقی نگاہ ڈالنا اس لیے ضروری ہو گیا تھا کہ دکن میں چلنے والی اس صنف نثر میں ہزاروں قسم کی جدتیں روا رکھی گئی تھیں۔ اس غرض سے مواد کو اکٹھا کر کے ڈاکٹر آف فلاسفی کے حصول کے لیے کام کا آغاز کر دیا گیا اور اب یہ مقالہ اس حیثیت کا ضرور ہو گا ہے کہ اسے

دکنی ادبیات میں ایک اضافہ کا درجہ دیا جاسکے۔

"دکنی تذکرے" کے زیرعنوان مقالہ تحریر کرنے سے قبل یہ ضروری تھا کہ دکن کے حدود اربعہ قائم کیے جائیں۔ چونکہ یہ موضوع خالص تاریخ سے متعلق ہے۔ اسی لیے ابھی تک کسی ادیب نے اسے چھیڑنے کی کوشش نہیں کی۔ جب تک علاقوں کا تعین نہ ہوتا یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ دکنی تخلیقات اور خاص طور پر تذکروں کا احاطہ کیا جائے۔ چنانچہ قدیم دکن یعنی بندھیاچل سے لے کر راس کماری تک پھیلے ہوئے علاقے پر موجود مختلف سلاطین کی حکومتوں کے پس منظر میں دکنی تذکروں کی اہمیت و افادیت واضح کی گئی۔ چنانچہ دکن میں دکنی یا اردو کو پروان چڑھانے والے خاندان بہمنی سلطنت، قطب شاہی سلطنت گولکنڈہ عادل شاہی سلطنت بیجاپور، نظام شاہی سلطنت احمد نگر۔ بریدشاہی سلطنت بیدر۔ عماد شاہی سلطنت برار، مغلیہ سلطنت اورنگ آباد، مظفری خاندان گجرات، فاروقی خاندان۔ خاندیس اور غوری خاندان مالوہ۔ یہ ایسے ستون ہیں جنھوں نے دکن پر نہ صرف حکومت کی بلکہ دکنی ادب کے فروغ میں بھی حصہ لیا۔ عہد حاضر میں آصفیہ خاندان، نوابان حیدرآباد اور نوابانِ میسور کی وجہ سے بھی دکنی ادب کا ارتقاء رہا۔ اس طرح دکنی ادب کا علاقہ گولکنڈہ۔ بیجاپور۔ احمدنگر۔ بیدر۔ برار۔ اورنگ آباد۔ گجرات۔ خاندیس۔ مالوہ۔ حیدرآباد۔ میسور اور مدراس کو احاطہ کیے ہوئے ہے جبکہ موجودہ دور میں دکن کافی محدود ہو گیا ہے۔ ان تمام علاقوں سے دکنی تذکروں کی نمائندگی کو مقالہ میں شامل کیا گیا ہے تاکہ عنوان کا حق ادا ہوسکے۔

دکنی تذکرے کے عنوان سے صرف دکنی زبان میں تحریر کردہ تذکرے مراد نہیں لیے جائیں گے بلکہ دکن میں اور اس کے مختلف علاقوں میں تحریر کردہ وہ تمام تذکرے اس عنوان کے تحت یکجا کیے جائیں گے جو دکنی ادیبوں کے کارناموں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ دکنی تذکروں کی ایک طویل فہرست ہے۔ مقالہ میں صرف غیرمطبوعہ تذکروں پر بحث کی گئی ہے۔

جبکہ مطبوعہ تذکروں کی فہرست کو آخر میں شمار کیا گیا ہے۔ دکن کے مطبوعہ تذکرے کتب خانوں میں دستیاب ہیں اور چونکہ ان پر بحث سے مقالے میں طوالت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی لیے مطبوعہ دکنی تذکروں پر بحث سے احتراز کیا گیا ہے تاکہ موضوع غیر مربوط نہ ہونے پائے البتہ انفرادی نوعیت کے مطبوعہ تذکروں کو عنوان کی مناسبت سے ضرور زیر بحث لایا گیا ہے۔

دکن میں تحریر کردہ بیشتر تذکرے اپنی انفرادیت کو اجاگر کرتے ہیں لیکن تذکرہ خوشنویساں آثار الادبان، تذکرۂ طوطیان ہند اور تذکرۂ خاندان نواب رفعت الملک یہ ایسی غیر مطبوعہ تخلیقات ہیں جن میں جدت پسندی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ مطبوعہ تذکروں میں تذکرۂ ذاکرین، تذکرۂ یورپین شعرائے اردو، تذکرۃ الخطابہ۔ تذکرۂ اطبائے عہد عثمانی، تذکرۂ شعبہ قانون، تذکرہ دارالعلوم وغیرہ یہ ایسے تذکرے ہیں جن کی بدولت دکنی تذکروں کے فن میں جدت پسندی کو روا رکھا گیا۔ اس طرح دکن "فن تذکرہ" کی روایت کو پروان چڑھانے میں انفرادی حیثیت حاصل کر لیتا ہے۔

تحقیقی ادب پارے کا درجہ متعین کرنے کے لیے تنقیدی اور تخلیقی کارناموں کے ساتھ ساتھ ابواب کی تشریح اور اس کے محاکماتی جائزہ کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ عام طور پر تحقیقی کارناموں میں حوالہ جات اور لسانی تشریحات کی اس قدر کثرت ہوتی ہے کہ عام قاری اس کے تفصیلی مطالعہ سے قبل تحقیقی مقالہ کے ابواب کے محاسبہ سے اس کی انفرادیت اور اہمیت و افادیت کا اندازہ قائم کرنا چاہتا ہے۔ جس کی وجہ سے لازمی ہو جاتا ہے کہ ہر باب کے بارے میں مختصر مختصر وضاحت کے ساتھ ان ابواب کے بارے میں بھی اشارہ کیا جائے جو تحقیق کے دائرے میں ہوتے ہوئے بھی تخلیقی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ موجودہ تحقیق میں صرف نوادرات، مخطوطات اور حوالہ جات کی اہمیت نہیں ہوتی بلکہ ان کے استفادہ کے ذریعہ مقالہ نگار جن نکات کی تشریح و توضیح کرتا ہے انھیں بھی خصوصی مرتبہ دیا جاتا ہے۔ "دکنی تذکرے" مقالہ تحریر کرنے کے

دوران ابواب کی ترتیب میں اس بات کو خاص طور پر دھیان میں رکھا گیا کہ باب اول سے آخر تک صرف سرخیوں کے مطالعے سے قاری فن تذکرہ اور دکنی تذکروں کے بارے میں اپنے ذہن میں ایک نقشہ مرتب کر سکے اور دکنی تذکروں کی تمام ترا[illegible] تاریخ اس کے سامنے آجائے۔ اس غرض سے مقالہ کو ۷ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے اور آخر میں مطبوعہ تذکروں کی فہرست کے ساتھ ساتھ کتابیات کو بھی شامل کر دیا گیا ہے تاکہ مطالعہ کے دوران کسی قسم کی پیچیدگی نہ پیدا ہو اور قاری کو باآسانی مقصد حاصل ہو جائے۔

مقالہ کا پہلا باب تذکرہ کے فن سے متعلق ہے۔ گو کہ متعدد کتابوں اور رسائل میں تذکرہ کے فن کے بارے میں مضامین شائع ہوئے ہیں لیکن ضرورت اس بات کی تھی کہ فن تذکرہ کی صنف کے بارے میں مواد فراہم کیا جائے۔ چنانچہ اس باب میں تذکرے کے تقاضے سے بحث کرتے ہوئے اس کی ترتیب و انتخاب کا جائزہ لیا گیا ہے جس کے بعد غالباً اردو ادب میں سب سے پہلے فن تذکرہ ایک تالیف ہونے سے متعلق بحث کی گئی ہے اور تذکرہ کے معیار کی وضاحت کرتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ تذکرہ نگار کی ذاتی دلچسپی اور جد و جہد کی بنا ہی پر اس فن میں نکھار پیدا ہوتا ہے۔ اس باب کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ اس کے ذریعہ فن تذکرہ تخلیقی حیثیت کا درجہ رکھنے کے باوجود تالیفی خصوصیات کا حامل ہونے سے بحث کی گئی ہے جو اردو ادب میں سب سے پہلا قدم تصور کیا جائے گا۔

دوسرے باب کے ذریعہ تذکرہ سے استفادہ کرنے والے اصناف اور اس کی متبدلہ شکلوں سے بحث کرتے ہوئے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ تذکرہ ایک مرکب صنف سخن ہے۔ اور اسے کئی اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ تذکروں کی مختلف قسموں جیسے ملفوظات، یادداشت، روزنامچہ، سفرنامہ، سوانح حیات، خودنوشت اور سرگذشت کی فنی حیثیت سے بحث کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ

یہ تمام ذیلی اصناف فنِ تذکرہ کی خصوصیت کے نمائندہ ہیں۔ اسی لیے ان کا رشتہ تذکرہ سے گہرا ہے۔ تذکرہ کے فن کی اس انداز سے درجہ بندی اُردو میں پہلی کوشش ہے۔ ابھی تک کسی بھی محقق یا ناقد نے اس قسم کی درجہ بندی نہیں کی تھی جس کے نتیجہ میں یہ باب بھی اپنی انفرادیت برقرار رکھے ہوئے ہے۔

دکنی تذکرے کا تیسرا باب دل چسپی سے خالی نہیں کیونکہ اس باب میں مواد کے اعتبار سے اردو میں تحریر کردہ تمام تذکروں کی گروہ بندی کی گئی ہے۔ چنانچہ تذکروں کو مختلف گروہوں یعنی مذہبی تذکرے، ادبی تذکرے، سماجی تذکرے، انسائیکلو پیڈیائی تذکرے، صنفی تذکرے اور آئینی تذکروں میں تقسیم کرکے یہ ثابت کیا گیا کہ متن کے اعتبار سے بھی تذکروں کی تقسیم ممکن ہے۔ ابھی تک صرف ڈاکٹر حنیف نقوی نے اپنی کتاب "شعرائے اردو کے تذکرے" میں "تذکروں کی گروہی تقسیم کا بیڑا اٹھایا لیکن انھوں نے تذکروں کو تذکرہ بالذات، تذکرہ بالعہد اور اس قسم کی تشریحات سے مربوط رکھا۔ جبکہ مقالہ کے اس باب میں اُردو کے تمام تذکروں میں پیش کردہ مواد کو ذہن میں رکھتے ہوئے ان کے لیے موزوں عنوانات مختص کیے گئے ہیں جو انفرادیت کے ساتھ جدت پسندی کے بھی مظہر ہیں کیونکہ اردو ادب میں ابھی تک کسی نے یہ طریقہ نہیں اپنایا۔

مقالہ کا چوتھا باب تاریخی اہمیت اور مورخانہ جدوجہد کا علمبردار ہے جس کے ذریعہ دکن میں تذکروں کے آغاز اور ان کے عہد کی نشاندہی کی گئی ہے۔ دکن کے مختلف ادوار بہمنی، قطب شاہی، عادل شاہی، نظام شاہی، برید شاہی، عالمگیری، آصف جاہی خاندانوں کے ذریعہ فنِ تذکرہ کی ترقی اور ان ادوار کے تخلیق کاروں کی جدوجہد کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس باب میں دورِ قدیم سے لے کر عہدِ حاضر تک کے اہم تذکروں کی تاریخ اور ان کی ادبی حیثیت سے بحث کی گئی ہے۔ یہ باب اسی

وجہ سے اہمیت کا حامل ہو جاتا ہے کہ دکنی ادبیات کی تاریخ مرتب کرنے کے دوران حکیم شمس اللہ قادری نے "اردوئے قدیم" اور نصیر الدین ہاشمی نے "دکن میں اردو" میں وہ گوشے واضح نہیں کیے جن کا ذکر اس باب میں کیا گیا ہے۔ البتہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے "تاریخ ادب اردو" میں کسی قدر حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن دکنی تذکروں کے آغاز و عہد کے بارے میں ابھی تک کسی نے اس طرح تحقیقی جائزہ نہیں لیا جس طرح کہ اس باب میں شامل کیا گیا ہے۔

مقالہ کا پانچواں باب تحقیقی کوششوں کا عرق کہا جا سکتا ہے کیونکہ اس کے ذریعے دکنی تذکروں کی امتیازی خصوصیات واضح کرنے کے لیے ایسے تمام منفرد تذکروں سے بحث کی گئی ہے جو ہیئت کی تبدیلی کے ساتھ فن تذکرہ میں جدید اضافہ کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس حقیقت کو ثابت کرنے کے لیے دکن میں تذکرہ کو جن جن طریقوں سے برتا گیا۔ اس پر تنقیدی بحث کی گئی ہے۔ تذکرہ نگاروں کی منفرد مزاجی کو ظاہر کرتے ہوئے اس باب میں تذکرۂ بطور کارنامہ ملازمت۔ تذکرہ بطور تاریخ ادارہ، تذکرہ بطور ذخیرہ معلومات، تذکرہ بطور تاریخ عمارت، تذکرہ بطور شجرہ، تذکرہ بطور تاریخ خطابات تذکرہ بطور سیرت شخصی تذکرے، ادبی تذکرے، مذہبی تذکرہ اور تاریخی تذکروں کے نمائندہ دکنی تذکروں کے اہم اقتباسات درج کرکے یہ بتایا گیا ہے کہ دکن میں جس قدر بھی تذکرے لکھے گئے۔ ان تمام کو منجملہ ۱۱ حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے اور ان ہی کی بدولت دکنی تذکروں کو اردو ادب میں خاص مرتبہ دیا جاتا ہے۔ یہ باب بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے انفرادیت برقرار رکھے ہوئے ہے۔

چھٹے باب کو دکنی تذکروں کے محاسن و معائب کے اظہار کے لیے مختص کیا گیا ہے تاکہ ان تذکروں کی اہمیت و افادیت کا اندازہ ہو سکے۔ دکنی تذکروں کے محاسن کو بیان کرنے

کے لیے ۶ عنوانات ہمہ جہتی اظہار۔ روایت پرستی۔ مورخانہ شعور، لسانی مزاج، ذاتی غور وفکر اور انتخاب کا معیار کے ذریعہ دکنی تذکروں کی ادبی و معیاری حیثیت کو واضح کیا گیا ہے۔ اسی طرح معائب سے چشم پوشی بھی نہیں کی گئی۔ انھیں بھی ۶ عنوانات، زبان کے سقم غیر تفصیلی مواد۔ ہمدردانہ رویہ۔ مشکوک حوالے، غیر معتبر ماخذات، ذوق صحیح کی کمی کے ذریعہ ظاہر کیا گیا ہے۔ اس طرح اس باب کے ذریعہ دکنی تذکروں پر تنقید کرتے ہوئے غیر جانبدارانہ انداز میں تذکروں کے ہر پہلو سے بحث کی گئی ہے جس کی وجہ سے دکنی تذکروں کی اہمیت میں اضافہ ہوگا۔

غیر مطبوعہ دکنی تذکروں کے تحقیقی جائزے کو ساتویں باب میں جگہ دیتے ہوئے ایسے اہم تذکروں پر بحث کی گئی ہے جن کا ابھی تک کسی محقق نے تذکرہ تک نہیں کیا۔ ان قلمی تذکروں کے عہد، مصنف، سنہ تالیف اور ان کی ادبی اہمیت کو تحقیقی انداز میں بیان کرتے ہوئے ان کی ہمہ جہتی حیثیت کو واضح کیا گیا ہے۔ اس باب میں صرف ریاض حسنی کے علاوہ دیگر تمام تذکروں کو ادبی دنیا میں پہلی بار روشناس کروایا گیا ہے۔ آثار الاوطان۔ تذکرہ جوہر فرد۔ تذکرہ خاندان نواب رفعت الملک، تذکرۂ خوش نویسان، تذکرۂ شعراء تذکرہ طوطیان ہند، اور تذکرۂ عطائے تمکین، یہ ایسے تذکرے ہیں جن کے تعارف پر کسی محقق نے توجہ نہیں کی۔ اس مقالہ میں سب سے پہلے انھیں متعارف کروایا گیا ہے جس سے دکنی ادب کی ساکھ میں اضافہ ہوگا۔

مقالہ کے آخر میں مطبوعہ دکنی تذکروں کی فہرست دی گئی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دکنی تذکرہ نویسوں نے لاتعداد تذکرے تحریر کیے۔ اس فہرست میں مذہبی۔ سیاسی۔ ادبی۔ معاشرتی غرض ہر قسم کے تذکروں کو شامل کر دیا گیا ہے۔ تاکہ فہرست کے مطالعہ سے دکنی ادب میں اس نئے اضافہ سے واقفیت ہو سکے۔ اس طرح مقالہ کو دور جدید کے تمام تحقیقی ذرائع سے آراستہ کیا گیا ہے۔ سنہ ۱۹۷۹ء سے سنہ ۱۹۸۱ء کے

تین سالہ عہد میں اس مقالہ کی تکمیل ہوئی۔ مکمل طور پر قلمی نسخوں کو کام میں لاتے ہوئے تنقید و تبصرہ کے بعد انھیں ابواب میں جگہ دی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی چند مطبوعہ تذکروں کو بھی ابواب میں شامل کیا گیا ہے تاکہ دکنی تذکروں کی انفرادیت واضح ہو سکے۔ غرض اس مقالے کی پیشکشی کے بعد دکنی ادب چند نئے تذکروں سے مالا مال ہو جائے گا اور مادر وطن ہونے کے ناطے مجھے اس علاقے کے تخلیقی کارناموں پر فخر کرنے کا موقع مل جائے گا۔

مقالہ تحریر کرنے کے دوران دکن میں اردو کے اہم مراکز برہان پور، دولت آباد اورنگ آباد، احمد نگر، بیجاپور، قندھار، گلبرگہ، بیدر، برار، خاندیس، گولکنڈہ حیدرآباد۔ بودھن، کرنول، کڑپہ، ترچناپلی، مدراس، بنگلور، میسور، بمبئی اور دیگر علاقوں سے استفادہ کا موقع ملا۔ ان علاقوں سے متعلقہ مواد کچھ تو سفر کے ذریعہ حاصل کیا گیا اور کچھ ایوان اردو حیدرآباد۔ اسٹیٹ سنٹرل لائبریری حیدرآباد عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری حیدرآباد۔ اسٹیٹ آرکائیوز حیدرآباد سے بسیاب ہوا۔ سالار جنگ میوزیم لائبریری سے مخطوطہ کی دستیابی ممکن ہو سکی۔ جس کے لیے میں ان لائبریریوں کے حکام کا شکر گزار ہوں۔ مقالہ کی ترتیب کے لیے اطہر علی اسد اور سید اصغر حسین اور تحریر کے لیے بہن ممتاز جہاں صدیقی لکچرر سیوا جی کالج پربھنی کا تعاون حاصل رہا جبکہ مقالہ ٹائپ کرنے کے لیے یسین شریف نے اپنی خدمات دیں جن کا میں تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ مقالہ تحریر کرنے کے لیے رہنمائی اور ہر قدم پر مشورے سے نوازنے والی ہستی پروفیسر ڈاکٹر امانت شیخ صاحب کی ہے جو نہ صرف میرے گائیڈ ہیں بلکہ کرمفرما بھی ہیں جن کی مشفقانہ رہنمائی اور مشوروں کی وجہ سے اس مقالہ کی تکمیل ممکن ہو سکی۔ ان کی ذات میرے لیے مسیحا کا درجہ رکھتی ہے۔ ان ہی کے مشورے کی بنا پر دکنی ادب کی ایک اہم صنف "تذکرہ" پر یہ مقالہ تحریر کیا جا سکا اور ان کی مدد شامل حال ہونے کی وجہ سے ہی اسے پونہ یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے داخل کیا جا سکا۔ امید ہے کہ اس مقالہ سے دکنی ادب خصوصاً دکنی نثر میں نئے گوشے اجاگر ہوں گے۔ ڈاکٹر حمید بیدار

باب اوّل

تذکرہ نگاری کا فنّی جائزہ

ادب کی ایک قسم کی حیثیت سے تذکرہ نگاری اُردو نثر کی قیمتی یادگار ہے ایک صنف نثر اور اُردو کی پہلی آزمودہ قدیم طرزِ تحریر کی حیثیت سے تذکرے کی اہمیت اردو ادب میں دوبالا ہو جاتی ہے۔ اُردو نثر میں یہ فن فارسی ادب سے مستعار لیا گیا۔ لیکن اس اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسی فن کی بدولت دورِ جدید میں اُردو ادب کی تاریخ مدوّن کرنے میں سہولت میسّر آئی ہے۔ تذکرہ کا فن اور تذکرہ نگاری کی روایت، اردو ادب کے مایہ ناز کارناموں اور شعراء کے حالات کی پیش کشی کا قیمتی ذریعہ ہیں۔ تذکرے کی اس اہمیت سے واقفیت کے بعد یہ ضرورت پیش آتی ہے کہ اس صنف کے فن میں کون سی خوبیاں پوشیدہ ہیں انہیں تلاش کیا جائے اور کن خصوصیات کی بنا پر یہ فن اُردو نثر کی تاریخ پر چھایا رہا دریافت کیا جائے۔ عام طور پر اُردو نثر کی مختلف اصناف، وقت و حالات اور زمانے کی دست و برد کا شکار ہو گئیں۔ لیکن تذکرہ ابھی تک اپنے فنّی لوازمات کے ساتھ جاری و ساری ہے۔ تذکرے کی یہ فعال صفت ثابت کرتی ہے کہ فن تذکرہ میں اس قدر جامعیت ہے کہ اس نے دورِ قدیم میں بھی اپنی حیثیت کو برقرار رکھا اور دورِ جدید میں بھی اس کا عمل دخل باقی ہے۔ اُردو ادب میں داستان نگاری مرحوم صنف ہوئی اور ایسی ہی متعدد اصناف ہیں جو ادب

میں داستانِ پارینہ کی حیثیت حاصل کر گئیں لیکن تذکرہ اسی آب و تاب سے اپنی فنی خصوصیت واضح کر رہا ہے۔ جو میر کے دور سے اپنی فنی روایات کو قائم کیے ہوئے تھا۔ اگر دورِ جدید میں تذکرہ کی صنف فعّال نہ ہوتی تو اردو کے نامور ادیب مولانا آزاد اپنی خود نوشت کا نام "تذکرہ" نہ رکھتے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تذکرہ کی صنف روایتی اعتبار سے شروع ہوئی اور دورِ جدید تک اس کا اثر فنی میلانات کے ساتھ جاری وساری ہے۔

تذکرہ نگاری ایک مجمع صنف کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس میں مختلف شخصیتوں کے چہرے ابھرتے ہیں اور ان کے کارناموں سے تذکرہ کی اہمیت و افادیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ فن تذکرہ صرف شخصیتوں کے خط و خال واضح کرنے کا ذریعہ نہیں بلکہ شخصیتوں میں پوشیدہ خصائل کو بھی واضح کرنے کا نام ہے جو ایک خوبی کی حیثیت سے شخصیتوں کی زندگی کا لازمہ بن گئے ہوں۔ چنانچہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ اردو میں شاعروں اور اولیائے کرام کے تذکرے لکھے گئے جن کا مقصد صرف یہی تھا کہ شاعر کی شخصیت میں پوشیدہ خصوصیت یعنی شعر گوئی اور ولی کی شخصیت میں پوشیدہ خصوصیت یعنی کرامات کو واضح کیا جائے۔ اس پس منظر میں اردو کے تمام تذکروں کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ تذکرہ نگاری کا سب سے پہلا اصول یہی ہے کہ انسان میں چھپی ہوئی صلاحیت اور اس سے مطابقت رکھنے والی دلچسپیوں کو واضح کیا جائے۔ تذکرہ نگاری کے فن کا یہ کلیہ اردو کے تمام اقسام کے تذکروں پر صادق آتا ہے۔ اس پس منظر میں تذکرہ کے فن کو شخصیت کے حالات بیان کرنے اور اس کی دلچسپیوں کی احاطہ بندی کرنے والی صنف کا نام دیا جا سکتا ہے۔

تذکرہ کا فن :

اصولی طور پر تذکرہ "ذکر" کے معنی سے مربوط ہے۔ عربی سے اردو میں مروج ہونے والا یہ لفظ مجرد حیثیت سے اردو میں رواج پایا اور فارسی کے زیر اثر اردو ادب میں اس لفظ کو صنف کی حیثیت

حاصل ہوئی۔ عام انداز میں تذکرہ بہ معنی ذکر کے مروج ہے۔ لیکن اصطلاحی اعتبار سے تذکرہ متعدد اشخاص کے حالات اور کارناموں کو ایک کتاب میں جمع کرنے کی شہادت دیتا ہے۔ یعنی تذکرہ ایک ایسی صنف ہے جس میں فن کے جلیل القدر اصحاب کی سوانح اور ان کی انفرادی خصوصیات کو واضح کیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے تذکرہ کا فن ایک کتاب کا محتاج ہوتا ہے۔ یعنی جب تک کئی اہم شخصیتوں کو مبسوط نہ کیا جائے اس کی حیثیت تذکرہ کی نہ ہوگی۔ اس فنی جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تذکرہ کے فن کے لیے سب سے بڑی ضرورت اشخاص کے حالات اور ان کے کارناموں کو جمع کرکے اُسے کتابی شکل دیتا ہے۔ جب تک اس اصول کی تکمیل نہیں ہوگی کوئی بھی تحریر شدہ متن تذکرہ کے ضمن میں شامل نہیں کیا جائے گا۔

فن تذکرہ کی ایک اہم ضرورت یہ بھی ہے کہ تذکرہ کی تحریر کے لیے ایک ہی فن میں ماہر کئی اشخاص کے حالات یکجا کیے جائیں اور انہیں تذکرہ نگار اپنی سہولت کے اعتبار سے ترتیب دے۔ یعنی اگر کوئی مؤلف کسی ایک شخصیت کے حالات اور کارناموں کو کتابی شکل دے کر اسے تذکرہ کا نام دے تو فنی لحاظ سے اس کی حیثیت تذکرہ کی نہ ہوگی۔ چونکہ تذکرہ کے لیے لازم ہے کہ جس کتاب کو تذکرہ کا نام دیا جائے اس کا متن متعدد اشخاص کی سوانح اور دلچسپیوں کے بارے میں معلومات فراہم کرتا ہو۔ چنانچہ ایسی تمام کتابیں جو صرف ایک شخصیت کے حالات اور کارنامے بیان کرنے کے لیے لکھی گئیں۔ لیکن انہیں تذکرہ کا نام دیا گیا تو ان کی حیثیت فنی اعتبار سے تذکرہ کی نہ ہوگی۔ کیونکہ ان پر فن تذکرہ کا اطلاق نہیں ہوسکتا چنانچہ تذکرۂ بابر، تذکرۂ جمیل، تذکرۂ حسن، تذکرۂ حسین، تذکرۂ حمید الدین چشتی، تذکرۂ سعید، تذکرہ بمولوی مرتضیٰ غرض اس قسم کی تمام کتابیں تذکرہ کے فنی تقاضوں کی تکمیل نہ کرنے کی وجہ سے "تذکرہ" نہیں کہی جائیں گی۔
ہر فن کچھ تقاضوں کی پابندی کرتا ہے اور ان تقاضوں کی تکمیل ہی فن کی زندگی کی

علامت ہے۔ تذکرہ کا فن بھی کئی تقاضوں کا متحمل ہے اور تذکرہ نگار سے ان تقاضوں کی تکمیل کی توقع رکھتا ہے۔ ذیل میں تذکرہ کے تقاضوں سے بحث کی جائے گی۔

فنِ تذکرہ کے تقاضے

فنی معیاروں کو پرکھتے ہوئے فن کے التزام کے لیے جو اصول بروئے کار لائے جاتے ہیں انہیں فن کے تقاضوں کا نام دیا جاتا ہے۔ عام طور پر ہر فن چند روایتی اصولوں پر کاربستہ رہتا ہے جیسے باشعور فن کار اپنے زمانے اور حالات کے ردّوبدل کے اعتبار سے روایت سے نکال کر جدیدیت کے پیراہن سے سنوارتے ہیں۔ فن تذکرہ کے تقاضوں کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ درحقیقت تذکرہ کا فن روایتی تقاضوں کا بے انتہا پابند ہے۔ اور تذکرہ نگاروں نے بھی ان تقاضوں کی بھرپور تائید کرتے ہوئے ان کی تکمیل کو لازمی قرار دیا۔ چنانچہ یہ دیکھا گیا ہے کہ میر تقی میر کی "نکات الشعرا" سے لے کر عہد حاضر کے تذکرے تک ہر ایک میں فنِ تذکرہ کے روایتی تقاضوں کی پوری طرح تکمیل کی گئی ہے۔ ان سے واضح ہوتا ہے کہ فنِ تذکرہ نگاری میں تذکرہ کے تقاضے اصول کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔

اعتدال اور توازن سے فن تذکرہ میں نزاکت پیدا ہوتی ہے جو تذکرہ کا پہلا تقاضہ ہے جس کے بغیر فن کی تکمیل ممکن نہیں۔ تذکرہ کا دوسرا تقاضہ حالات اور سوانح کے دوران اختصار ہے۔ یعنی تذکرہ کے دوران شخصیت کے حالات پیش کرنے کے لیے اختصار سے کام نہ لیا جائے تو تذکرہ سوانح میں تبدیل ہو سکتا ہے۔ اعتدال اور توازن سے مراد تذکرہ نویس کا بیانیہ استدلال ہے جس کے دوران اُسے صرف حقیقت کی عکس کشی سے کام لینا پڑتا ہے۔ جس کے ساتھ ہی اس پر لازم آتا ہے کہ بیان کے دوران وہ معتدل رویّہ اور متوازن اسلوب اختیار کرے ورنہ تذکرہ تشنہ رہ جائے گا۔

تذکرہ کا تیسرا تقاضہ نقالی سے پرہیز ہے۔ جب تک تذکرہ نویس دقتِ نظر اور قوتِ فیصلہ کی خصوصیات کا حامل نہیں ہوتا اس وقت تک اس کا تذکرہ نقالی کی حیثیت میں رہے گا۔ عام طور پر اردو تذکروں پر توارد، خوشہ چینی، اکتساب اور استفادہ کا جو الزام لگایا جاتا ہے اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ چند اہم تذکروں کو سامنے رکھتے ہوئے شعر و شاعری سے دل چسپی رکھنے والے متعدد افراد نے نقالی سے کام لیا ہے۔ جبکہ جن تذکرہ نویسوں نے جگر کا وی کا ثبوت دیا۔ ان کے تذکرے ادبی طور پر اہمیت کے حامل سمجھے گئے جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ تذکرہ نقالی سے پرہیز کا تقاضہ بھی رکھتا ہے۔

مختلف شخصیات کی منفرد مزاجی اور انکی شخصیت کے قابلِ تعریف گوشوں سے واقفیت فنِ تذکرہ کے چوتھے تقاضے میں داخل ہے۔ جب تک تذکرہ نگار اس اصول کی تکمیل نہیں کرے گا اس وقت تک تذکرہ صرف شخصی حالات کا ایک مرقع بنا رہے گا۔ تذکرہ کے اس تقاضہ کے ذریعہ اخذ و ترک کا طریقہ اپنایا جاتا ہے۔ یعنی شخصیت کے حالات اور قابلِ تعریف واقعات کے بیان کے دوران فنِ تذکرہ کا تقاضہ ہے کہ اخذ و ترک سے کام لیا جائے۔ اگر یہ عمل کارفرما ہو گا تو تذکرہ مبسوط سوانح کی شکل اختیار کرے گا۔ اس تقاضہ کے ذریعہ صاحب شخصیت شاعر یا صوفی کے کارناموں کو مختلف کتابوں سے اخذ کرنے اور قابلِ اعتراض بیانات کو ترک کرنے کا کام لیا جاتا ہے۔ عام طور پر تذکرہ میں یہ عمل اس کی ادبی حیثیت کو دوبالا کرنے کا ضامن ہے۔ کیونکہ اسی عمل کے ذریعہ تذکرہ میں غیر ضروری متن سے پرہیز کر کے اہم اور ضروری معلومات کو اکٹھا کیا جاتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں فنِ تذکرہ کے تقاضوں میں اخذ و ترک بڑی اہمیت کے حامل ہو جاتے ہیں۔

فنِ تذکرہ کا پانچواں تقاضہ تذکرہ کی ترتیب و تدوین ہے جس کے بغیر

تذکرہ کا التزام ممکن نہیں۔ اس تقاضہ کے ذریعہ تذکرہ نگار جامع اصول اور نظم وضبط کے ساتھ تخلص کے حرفِ اوّل کی رعایت یا حروف تہجی کی ترتیب کے مطابق حالات اکٹھا کر کے انھیں تذکرہ کی شکل میں پیش کرتا ہے جس سے نہ صرف ترتیب میں اصولوں کی پابندی ظاہر ہوتی ہے بلکہ بآسانی کسی بھی شاعر کے حالات ترتیب کے لحاظ سے معلوم کیے جا سکتے ہیں۔ تذکرہ میں ترتیب و تدوین کا عمل شاعر یا صوفی کے حالات اور کارناموں کی صحت کا ضامن ہے۔ یعنی تذکرہ نگار جس قدر ترتیب و تدوین میں اصول پسندی سے کام لے گا اُسی قدر اس کا تذکرہ جامع ترین قرار پائے گا۔ کیونکہ اسی عمل کے ذریعہ حالات کی تکرار اور شخصیت سے غیر متعلقہ مواد سے انحراف کیا جا سکتا ہے اس تقاضہ کے ذریعہ فنِ تذکرہ میں جامعیت اور موزوں متن کی پیش کشی کے لیے راہیں ہموار ہوتی ہیں۔

کلام کی ترتیب فنِ تذکرہ کے چھٹے تقاضہ میں داخل ہے۔ جب تک ادبی تذکروں میں شعراء کے کلام کی ترتیب کو شامل نہ کیا جائے۔ تذکرہ کی حیثیت فنی اعتبار سے موزوں نہیں ہوگی۔ مذہبی تذکروں میں صوفی یا ولی کی کرامت کو ترتیب میں شامل کیا جاتا ہے۔ غرض تذکرہ میں لازمی ہے کہ شاعروں کا منتخبہ کلام اور صوفی یا ولی کے منتخبہ کرامات یکجا کیے جائیں۔ جب تک اس عمل کی تکمیل نہ ہوگی تذکرہ کا فنی تقاضہ پورا نہ ہوگا۔ جہاں تک کلام کی ترتیب اور کرامات کی پیشکشی کا تعلق ہے یہ تذکرہ نگار کا فریضہ ہے کہ وہ معیاری اور قابل فہم کلام اور کرامات تذکرہ میں شامل کرے۔ معیاری تذکرہ کی یہی خصوصیت اہمیت کی حامل سمجھی جاتی ہے کہ ان تذکروں میں شخصیت کے حالات کافی جانچ پڑتال کے بعد پیش کرنے کے علاوہ ان تذکروں میں شاعروں کا معیاری کلام شامل کیا جاتا ہے۔ اکثر تذکرے اس وجہ سے ادبی طور پر غیر معیاری قرار دیئے گئے کہ ان میں پیش کردہ منتخبہ کلام ترتیب کے اصولوں

کی نمائندگی نہیں کرتا تھا۔ غرض ادبی تذکرہ میں معیاری کلام منتخب کرنا ایک ضروری شرط کا درجہ رکھتا ہے جس کے لیے ضروری ہے کہ ہر شاعر کا کلام اس طرح انتخاب کیا جائے کہ جس کے مطالعہ سے فن کی تمام خوبیاں اور خامیاں واضح ہو سکیں۔ یعنی انتخاب کے دوران کلام کے محاسن اور معائب پر نظر رکھنا ضروری ہے۔ صرف معیاری یا غیر معیاری اشعار کی پیش کشی انتخاب کے صیغہ میں نہیں آتی اور یہ ترتیب کے اصولوں کے مغائر ہے اس لیے تذکرہ نگار پر لازم ہے کہ وہ غیر جانب داری سے انتخاب کے تقاضہ کو پورا کرے۔

فنِ تذکرہ کا ساتواں تقاضہ تذکرہ کے اسلوب سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جس کے ذریعہ تذکرہ نگار وقائع نویسی، رنگین بیانی اور عبارت آرائی سے پرہیز کرتے ہوئے سادگی اور پرکاری کے دلکش انداز تحریر سے تذکرہ کو مزین کرتا ہے۔ تذکرہ کے اسلوب کیلئے لازمی ہے۔ کہ ایسا انداز اختیار کیا جائے جو نہ صرف واضح ہو بلکہ دل چسپی برقرار رکھنے کا سبب بھی بنے تمام کامیاب ادبی اور مذہبی تذکرے ان خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں۔ جس کے نتیجہ میں ان کا مرتبہ کافی بلند ہے۔ تذکرہ میں اسلوب کے دوران ژولیدہ بیانی نہ صرف فنی طور پر تذکرہ کو غیر معیاری بنا دیتی ہے بلکہ اس کے ذریعہ تذکرہ کے تقاضہ کی تکمیل بھی نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ بعض دقیق قسم کے تذکرے اپنی ثقالت کی وجہ سے اردو ادب میں غیر معروف ہو گئے۔ جن تذکروں میں ان سات تقاضوں کی تکمیل نظر آتی ہے وہ فنی طور پر تذکرہ کے ضمن میں شمار کیے جائیں گے۔

تذکرہ کا لزوم

کسی زبان میں ادب کے آغاز کے ساتھ ہی اس کی اصناف نثر میں پیش کردہ متن پر مباحث کا سلسلہ بھی شروع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ تاریخ، سیرت، وقائع اور توزک یہ ایسے متبادل الفاظ رہے ہیں۔ جن کے بارے میں طویل بحثیں ہوتی رہی ہیں۔ عام طور پر سیرت، وقائع اور توزک کو ایک ہی سلسلے کی کڑی سمجھا جاتا ہے۔ اس پس منظر میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس تحریر پر تذکرہ کا اطلاق ہو اسکے

علاوہ کیا صرف ادبی طور پر تحریر کردہ سوانحی کتابوں کو تذکرہ کہا جائے گا۔ یہ ایسے مسائل ہیں جن پر بحث ضروری ہے تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ کن کتابوں پہ تذکرہ کا فیصلہ صادر کیا جائے گا۔ بعض ناقدین نے صرف ادبی تذکروں کو "فنِ تذکرہ" کے ضمن میں شامل کیا ہے اور بعض ناقدین مذہبی تذکروں کو ادب میں شامل نہیں کرتے۔ ان حقائق کی روشنی میں لازمی ہے کہ ان خصوصیات کا جائزہ لیا جائے جنھیں بنیاد بنا کر کسی کتاب کو تذکرہ کا درجہ دیا جاتا ہے۔ عام طور پر ایسی تمام تحریریں تذکرہ کے ضمن میں آئیں گی۔ جن میں ایک سے زائد شخصیات کے حالات اور کارنامے اکٹھا کر کے کتابی شکل میں جمع کر دیئے گئے ہوں۔ اس عمل کے لیے لازمی نہیں کہ وہ شخصیتیں صرف ادبی حیثیت کی حامل ہوں بلکہ مذہبی، سیاسی، سماجی، ثقافتی غرض ہر شعبۂ حیات سے تعلق رکھنے والے متعدد افراد کے حالات اور کارنامے کسی ایک کتاب میں جمع کر دینا "تذکرہ" کہلاتا ہے۔ اس تعریف سے تذکرہ کی حیثیت واضح ہو گئی۔ چنانچہ ایسی تمام کتابیں تذکرہ کے ضمن میں آئیں گی جو کسی ایک فن میں ماہر متعدد شخصیتوں کے حالات اور کارناموں کو اپنے دامن میں جگہ دیتی ہیں۔

کسی تحقیقی کتاب، جس میں متعدد شخصیتوں کا ذکر ہو اور ان کے حالات اور کارنامے بھی پیش کیے جائیں تو اسے تذکرہ کے ضمن میں شامل نہیں کیا جاتا ہے کیونکہ تذکرہ کا لزوم ایسی کتابوں پر ہوتا ہے۔ جن میں حالات اور کارنامے بیان کرنے کے دوران غیر معتبر ماخذات اور مشکوک مواد درج کیا جائے۔ چونکہ تحقیقی کتابوں میں معتبر ماخذات اور جامع مواد موجود ہوتا ہے اسی لیے ان کا شمار تذکرہ میں نہیں کیا جا سکتا۔ اس علمی ثبوت سے اندازہ ہوتا ہے کہ متعدد شخصیتوں کے بارے میں سوانحی مواد پیش کرنے والی ہر کتاب پر تذکرہ کا لزوم نہیں ہوتا بلکہ ایسی کتابیں ہی تذکرہ کے ضمن میں آئیں گی جن میں حالات اور واقعات کی پیش کشی کے دوران تحقیقی

انداز روا نہ رکھا جائے بلکہ تاریخ ادب و مذہب کی ترتیب کی غرض سے کچھ اہم ادبی و مذہبی شخصیتوں کے حالات یکجا کر دیئے جائیں۔ اس پس منظر میں یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ تذکرہ نگاری کے دوران مواد کی فراہمی کو اولین درجہ نہیں دیا جاتا اور نہ ہی شخصیت کے حالات جمع کرنے کے لیے کد و کاوش کی جاتی ہے بلکہ ذیلی طور پر علم میں آنے والے حالات و واقعات ہی کو مرتّب کر کے اسے تذکرہ کی شکل دے دی جاتی ہے۔ اس لحاظ سے تذکرہ میں جامع مواد کا نہ ہونا اس کی خصوصیات میں شامل ہے

فنّی طور پر تذکرہ کا اطلاق ان کتابوں پر بھی ہو گا جو کئی شخصیات کے حالات بیان کرنے کی بجائے صرف شخصیتوں کی تاریخ پیدائش اور وفات درج کرنے کے بعد صرف ان کے کارنامے بیان کرنے پر اکتفا کرتی ہوں اگرچہ ان تذکروں میں شخصی حالات درج نہیں ہوتے لیکن صرف اس بنیاد پر تذکروں کے فن میں شامل ہیں کہ ان کی وجہ سے کسی عہد میں موجود مختلف فنون میں ماہر شخصیات کے علمی و ادبی کارناموں کا علم ہوتا ہے۔ عام طور پر دکن میں ایسے متعدد تذکرے لکھے گئے جن میں صرف مذہبی شخصیتوں کے نام، تاریخ پیدائش، تاریخ وفات اور تاریخ عرس وغیرہ درج ہیں۔ چونکہ یہ کتابیں دورِ جدید میں علماء، صوفیاء، اولیاءؒ اور شعراء کی تاریخ ترتیب دینے میں مدد دیتی ہیں۔ اسی لیے ان پر بھی تذکرہ کا لزوم ہوتا ہے۔

شاعروں اور ادبی کارنامے انجام دینے والے اشخاص کے حالات اکٹھا کر دینا ہی تذکرہ میں شامل نہیں بلکہ فنِ تذکرہ کا اطلاق ان تمام ادبی، مذہبی اور دیگر شعبۂ حیات کے کارکنوں کی تفصیلات جمع کرنے والی کتابوں پر بھی ہو گا جو مستقبل میں تاریخ کی ترتیب میں مدد دیتی ہوں۔ اس لحاظ سے تذکرہ کا لزوم صرف ادبی سوانح پیش کرنے والی کتابوں پر نہیں ہوگا بلکہ زندگی کے تمام طبقے اور شعبۂ حیات سے متعلقہ افراد کے

حالات اور کارناموں کو کتابی شکل میں ترتیب دینا تذکرہ کہلائے گا جس میں تحقیقی عمل کارفرما نہ ہو اور تدوینِ متن کے دوران روا روی سے کام لیا گیا ہو۔ غرض تذکرہ ایک ایسا عمل ہے جو بذات خود ترتیب کا کام انجام دینے کے ساتھ ساتھ مستقبل میں تحقیقی ترتیب کے لیے سازگار ماحول پیدا کرتا ہے۔ تذکرہ عملی طور پر سوانح نہیں اور نہ ہی تاریخ ہے۔ اس کا شمار وقائع اور توزک میں بھی نہیں ہوتا بلکہ تذکرہ کو "انتخابی سوانح" کا نام دیا جاسکتا ہے اور ایسی تمام کتابیں جو شخصی حالات اور کارنامے ترتیب دینے کا حق ادا کرتی ہیں۔ فنی اعتبار سے تذکرہ کے ضمن میں آتی ہیں۔

تذکرہ کی جدلیات

ادبی تحریروں میں تذکرہ ترتیب یا انتخاب کے عمل کی نمائندگی کرنے کی وجہ سے ایک فن کا درجہ رکھتا ہے لیکن تذکروں کے مطالعہ کے بعد ناقدین اور محققین کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تذکرہ کو تخلیق کا درجہ دیں یا تالیف کی حیثیت سے اس کا مرتبہ متعین کریں۔ عموماً ہر تذکرہ میں اس کے مزاج، موضوع اور مواد پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ اور ہر تذکرہ نگار اپنے قلم کے ذریعہ موزوں شخصیت کے ادبی مزاج یا پھر اس کی مذہبی کارکردگی کے ساتھ ساتھ سوانح بھی پیش کرتا ہے۔ تذکرہ کے ان عوامل کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ تذکرہ ایک انتخابی عمل اور ترتیب کی خصوصیت رکھتا ہے۔ درحقیقت ترتیب کا عمل تالیف کا درجہ رکھتا ہے۔ تذکرہ کی حیثیت تصنیف کی نہیں اور نہ ہی اسے غیر تخلیقی کوشش قرار دیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ تذکرہ نگار صاحبِ شخصیت کی سوانح اور کارنامے بیان کرنے کے دوران تخلیقی عمل کا سہارا لیتا ہے اور بغیر اس تخلیقی قوت کے تذکرہ کی تکمیل ممکن نہیں۔ اس لیے تذکرہ تالیفی خصوصیت کا متحمل ہونے کے باوجود تخلیقی خصوصیت کا بھی حامل ہے جس کے نتیجہ میں تذکرہ ایک ایسی صنف قرار پاتا ہے جس میں تصنیف و تالیف کی خصوصیات کے ساتھ ساتھ تخلیق کے عناصر بھی کارفرما نظر آتے ہیں۔

مواد کے اعتبار سے تذکرہ کا مزاج سوانحی ہے یعنی تذکرہ میں شاعر یا صوفی کے حالات بیان کرنے کے دوران سوانحی خط و خال کو ملحوظ رکھا جاتا ہے اور تذکرہ نگار اپنی تحریر کی جولانی سے سوانحی مواد میں تخلیق کی خصوصیت کو اس طرح شامل کرتا ہے کہ تذکرہ میں ایک سے زائد شخصیات کی سوانح ہونے کے باوجود ترتیب کے دائرہ سے علیحدگی اختیار کر کے تالیف کے صیغہ میں شامل ہوجاتا ہے۔ عام طور پر کسی بھی موضوع یا عنوان پر متن کی ترتیب کا عمل "تالیف" کے شعبہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ اور یہ عمل انتخاب کی خصوصیت سے مزین ہونے کی وجہ سے تالیف ہونے کی عام صلاحیتوں کو اجاگر کرتا ہے۔ یعنی کوئی بھی کتاب جس میں ترتیب اور انتخاب کا عمل کارفرما ہوگا اسے تالیف کا درجہ دیا جائے گا۔ لیکن تذکرہ میں شعراء کے حالات کی ترتیب اور ان کے کلام کا انتخاب ہونے کے باوجود اس کا شمار ترتیب میں نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ترتیب میں متعدد اشخاص کے منتخبہ موضوعات کو جگہ نہیں دی جاتی جبکہ تذکرہ میں منتخبہ موضوعات کا نہ صرف عمل دخل ہوتا ہے بلکہ متعدد شعراء کے حالات اکٹھا کر کے تذکرہ نگار انہیں اپنی تخلیقی صلاحیت کے ذریعہ کتابی شکل میں ترتیب دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تذکرہ میں ترتیب و انتخاب کا عمل کارفرما ہونے کے باوجود اسے تخلیق کا درجہ حاصل ہے۔

فنی اعتبار سے تذکرہ کی جدلیاتی حیثیت ایک تخلیقی عمل کہلاتا ہے کیونکہ جب تک تذکرہ نگار کے ذہن میں شاعروں کی زندگی یا صوفیاء یا اولیاء کی کرامات کا خاکہ نہیں ہوگا اس وقت تک تذکرہ کی تحریر کا عمل بے سود رہے گا اور تذکرہ نگار لاکھ چاہتے ہوئے بھی کتاب تحریر نہ کرسکے گا جبکہ ترتیب کے دوران ذہن میں کسی قسم کا خاکہ مرتب کیے بغیر چند موضوعات کو اکٹھا کر کے کتابی شکل دی جاسکتی ہے۔ اس کے علاوہ ترتیب کے لیے چند کتابوں کے اقتباسات کا سہارا لیا جاتا ہے جبکہ تذکرہ نگاری کے دوران

اقتباسات سے مدد تو لی جاسکتی ہے۔ لیکن ان پر مکمل تکیہ نہیں کیا جاتا بلکہ تذکرہ نگار چند اہم کتابوں سے شخصیت کے سوانحی حالات اپنے ذہن میں محفوظ کر کے انھیں اپنے تخلیقی سرچشمہ کی بنیاد پر مرتب کرتا اور تحریر کی زد میں لاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تذکرہ میں ترتیب کی خصوصیت ہونے کے باوجود یہ تخلیقی سرچشمہ کا نمائندہ ہے۔

عمل، مواد اور اسلوب کی بنیاد دون پر تذکرہ کی حیثیت تالیف کی ہے

تذکرہ میں سوانحی حالات اور انتخاب کلام کے سوا کچھ نہیں۔ جس کے ساتھ ہی تذکرہ نگار کو اپنے اسلوب کے جوہر دکھانے کے بہت کم مواقع ہیں۔ نیز اُردو کے اکثر تذکروں میں شاعر یا صوفی کی شخصیت کے بارے میں متن کی حیثیت ذیل میں آتی ہے۔ یعنی تذکرہ نگار سوانحی خاکے نہیں بناتا بلکہ شخصیت کی زندگی کے حالات کے چند اہم کارنامے ضبط تحریر میں لاتا ہے۔ جس میں اسلوب کی تلاش اور اس کی منفرد مزاجی کو ٹٹولنا ایک مشکل امر ہے۔ کیونکہ تذکرہ نگار شخصی حالات کے دوران ایجاز و اختصار سے کام لیتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ تذکرہ میں اکثر شخصیت کو حالات کی لپیٹ میں بتایا جاتا ہے جو تخلیقی کارنامے کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ ایسا فعل ترتیب میں اختیار نہیں کیا جاسکتا کیونکہ تالیف کے انتخاب اور ترتیب کے دوران مؤلف کو اپنے قلم کی جادو نگاری دکھانے کا موقع نہیں ملتا اور تذکرہ میں چونکہ تذکرہ نگار کو اپنے تخلیق کے گوشوں کو واضح کرنے کی پوری سہولت دی جاتی ہے اور تذکرہ نگار اسے اپنی مرضی کے موافق استعمال کرتا ہے۔ اسی لیے تذکرہ فنی طور پر "تخلیق" کا درجہ رکھتا ہے اور اس فن میں ترتیب اور انتخاب کی خصوصیت ہونے کی وجہ سے یہ مکمل تالیف ہونے کی دلالت کرتا ہے۔

تذکرہ کا معیار

فن اور فن کی جانچ کے پس منظر میں جب تنقیدی رویّہ اختیار کیا جاتا ہے۔ تو سب سے پہلے فن کے معیار سے بحث کی جاتی ہے۔

ادبی طور پر تذکرہ ایک فن اور تخلیقی صلاحیت قرار دیئے جانے کے بعد اس کے معیار اور مسائل پر بحث بھی لازمی ہے۔ ناقدین اُردو، ادبی طور پر کسی ایک تذکرہ کو اہمیت کا حامل قرار دیتے ہیں جبکہ دوسرا تذکرہ ان کی نگاہوں میں بچنے نہیں پاتا جو اس بات کا ثبوت ہے کہ جب تک تذکرہ کا معیار نہ دیکھا جائے اس کی حیثیت اور مرتبہ کا تعین مشکل ہو جاتا ہے۔ فنی طور پر ہر تذکرہ اپنا معیار رکھتا ہے اور اپنے مخصوص مزاج اور ماحول کے ساتھ عہد کی ترجمانی کرتا ہے۔ فن اور معیار کے پس منظر میں تذکرہ تخلیقی سرچشموں تصنیف، تالیف اور ترتیب جیسی خصوصیات میں تالیف کی حیثیت رکھتا ہے اور ایک عمدہ تالیف کی حیثیت سے تذکرہ کا معیار متعین کرنا ادبی جایزے کے مترادف ہے!

ادبی، سیاسی اور مذہبی طرز و انداز کے نمائندہ تذکروں کا معیار فن کی جدت پر منحصر ہوتا ہے۔ تذکرہ کے معیار کو جانچنے کے لیے بیان، متن اور ترتیب کے طریقہ کار سے بحث کی جاتی ہے۔ جس تذکرہ میں بہتر بیان، جامع متن کے ساتھ ترتیب کا انوکھا انداز روا رکھا جائے وہ فنی طور پر معیاری تذکرہ قرار پائے گا۔ ان اصولوں سے کمتر درجہ کے تمام تذکرے اگرچہ فنی لوازمات کی پابجائی کریں گے۔ لیکن معیاری نہیں قرار دیئے جاسکتے۔ ہر دور میں متعدد تذکرے لکھے گئے لیکن ان تمام تذکروں میں انفرادی حیثیت کا حامل تذکرہ ہی معیاری قرار دیا جاتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جس تذکرہ نگار نے اصولِ تدوین کو پوری طرح سلوک میں لایا وہی کامیاب تذکرہ نگار قرار دیا گیا اور اس کا تالیف کردہ تذکرہ فنی اور ادبی طور پر معیاری تذکرہ کے ضمن میں شمار کیا گیا جو اس بات کا ثبوت ہے کہ نمائندہ تذکرے فنی معیار کے متقاضی ہوتے ہیں اور جن تذکروں میں اس معیار کی پابجائی نہیں ہوتی۔ وہ تذکرے کے فنی معیار پر پورے نہیں اُترتے۔

تذکرہ کے معیار سے مراد اس فن کو بلندی پر پہنچانے کے لیے اختیار کردہ وہ عمل ہے جو تذکرہ کے دوران اختیار کیا جاتا ہے۔ عام طور پر فن کی اصولی ترتیب، ہر تذکرہ میں پائی جاتی ہے۔

اور ہر تذکرہ اسی مقصد کے تحت لکھا جاتا ہے کہ اس میں تذکرہ کے فن کے تمام اصولوں کو بروئے کار لایا جائے۔ لیکن بہت کم تذکرے ایسے ہوتے ہیں جو اس معیار پر پورے اترتے ہیں۔ فنی طور پر تذکرہ کا تمام اصولوں کی پابجائی کرنا تذکرہ کا معیار کہلائے گا۔ اور اسی معیار کی بدولت تذکرہ کی جانچ پڑتال کی جاتی ہے۔ چونکہ تذکرہ تصنیف اور ترتیب سے ہٹکر تخلیقی سرچشمے تالیف سے متعلق ہے۔ اسی لیے اس کے معیار کی جانچ کے لیے تالیفی اصولوں کو روا رکھا جاتا ہے۔ جس تذکرہ میں ترتیب کا بہترین طریقہ جامع سوانحی مواد اور موزوں زبان و بیان کا سہارا لیا جائے۔ وہ نہ صرف معیاری تذکرہ کہلائے گا بلکہ اس کی وجہ سے ادب میں بھی اضافہ ہوگا۔

تذکرہ کے فنی جائزے میں جہاں اس کے فن سے معلومات حاصل کی جاتی ہیں وہیں تذکرہ کے تقاضے کے علاوہ تذکرہ کے اطلاق اور اس کی جدلیاتی حیثیت سے بھی بحث کی جاتی ہے۔ جب ان تمام خصوصیتوں کی جھلک تذکرہ میں موجود ہوگی تو معیاری طور پر اس تذکرہ کا مرتبہ بلند ہوگا۔ اور فنی اعتبار سے تذکرہ کی ہیئت بھی سامنے آئے گی۔

ادب میں تذکرہ کا مرتبہ

ہیئتی اعتبار سے ادب کی تمام اصناف تخلیقی رجحان کی ترجمان ہوتی ہیں۔ داستان، ناول، افسانہ، ڈرامہ اور شاعری کے تمام اصناف تخلیقی سرچشمے ہیں۔ ان کے برخلاف سوانح، تذکرہ، سفرنامہ اور آپ بیتی کا شمار تالیف میں ہوتا ہے۔ ادبی طور پر تذکرہ کی حیثیت ایک مکمل تالیف کی ہے جس میں بسا اوقات تذکرہ نگار اپنی جدّت طبع سے تصنیف کی خصوصیت لانے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن ترتیب اور انتخاب کے متن کی کثرت کی وجہ سے تذکرہ کو ادبی طور پر تصنیف کا درجہ نہیں دیا جاسکتا۔ تذکرہ میں تالیفی خصوصیات پوری طرح موجود ہوتی ہیں۔ سوانح کا بیان اور تذکرہ نگار کا اسلوب اگرچہ تذکرہ کو تصنیف کے قریب کرتے ہیں لیکن تاریخ اور سنین کے ساتھ ہر سال کے واقعات

اور زندگی کے اہم کارناموں کو پیش کرنے کے دوران تذکرہ نگار، انشا پردازی کے جوہر بھی دکھاتا ہے۔ یہ انداز تذکرہ کو تصنیف سے قربت بخشتا ہے۔ لیکن ترتیب و تدوین کے علاوہ تذکرہ کا بیشتر حصّہ انتخاب سے متعلق ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادب میں تذکرہ کا مرتبہ تالیف کی حیثیت سے نمایاں ہے۔

فنّی اعتبار سے تذکرہ نگاری ایک مجمع اور مرکب صنف ہے جس میں انتخاب کی صلاحیت بھی موجود ہے اور ترتیب کا سلیقہ بھی جس کے ساتھ ہی انشا پرداز اور اسلوب کے جوہر بھی تذکرہ کی صنف میں شامل ہیں۔ سوانحی مواد اور تاریخی جائزہ بھی تذکرہ کی صنف کا ایک جز ہے ان بنیادی خصوصیات کی بنا پر تذکرہ ادب کی ایک صنف ہونے کے علاوہ شخصیت کی ہمہ گیری کو کتابی شکل میں پیش کرنے کا دعویدار بھی ہے۔ اگرچہ شخصیت کے حالات پیش کرنے میں ایجاز و اختصار کی وجہ سے شخصیت کے بعض گوشے پنہاں رہ جاتے ہیں۔ لیکن اس نقص کے باوجود بھی تذکرہ ادبی طور پر ایک صنف کا مرتبہ رکھتا ہے اور یہ ایسی فعال صنف ہے کہ جس کی وجہ سے تاریخ مرتب کرنے میں مدد ملتی ہے۔ اور عہد قدیم میں شعر گوئی اور شاعرانہ چشمک کے علاوہ مشاعروں کی روایت کے بارے میں بھی تذکروں سے ہی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ادب میں تذکرہ کا مرتبہ ایک صنف اور تالیف کی حیثیت سے قبول کیا جاتا ہے۔ جس کے ساتھ ہی افادیت کی بنیادوں پہ تذکرہ فنّی طور پر ادبی تاریخ یا مذہبی تاریخ مدوّن کرنے کا بہترین اور معتبر ذریعہ بھی ہے۔

بابِ دوّم

تذکرہ نگاری کے اقسام

تذکرہ تحریر کرنے کی خصوصیات میں مختلف اسلوب مروج ہیں۔ ان میں طرز تحریر کے لحاظ سے چیدہ چیدہ فرق بھی پایا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ تمام اسلوبیات مکمل طور پر سوانح کے فن سے وابستہ ہیں لیکن ان کی تحریروں کے انداز میں فرق اور اصولوں کی تبدیلی کی وجہ سے انہیں مختلف عنوانات سے مربوط کیا گیا ہے۔ تذکرہ نگاری کا مقصدی پہلو سماج کی سربرآوردہ اشخاص کی زندگی اور حالات کے علاوہ کارناموں کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی سوانح پیش کرتا رہا۔ لیکن اصول پسندی اور شعوری ارتقاء تکمیلی حیثیت میں نہ ہونے کی وجہ سے سوانح نگاری روایتی طور پر تذکرہ کے روپ میں ترقی کرتی رہی اور یہی تذکرہ کا فن مختلف انداز سے اسلوب کو بدلتا ہوا متفرق عنوانات کا حامل رہا۔ یہی وجہ ہے کہ "اردو تذکرہ نگاری" کا تحقیقی و تاریخی جائزہ لیا جائے تو یہ فنی طور پر مختلف اقسام میں تبدیل ہو کر اپنے اسلوب کی علحدہ خصوصیت کی نمائندگی کرتا ہے۔

تذکرہ نگاری ایک ضمنی صنف کا درجہ رکھتی ہے۔ جس کی جدید ترقی یافتہ شکل سوانح نگاری آج کے ادبیات کی مقبول ترین صنف ہے۔ تذکرہ تحریر کرتے ہوئے اردو کے سوانحی ادب کے معماروں نے علحدہ علحدہ انداز اور مختلف طرز تحریر کو روا رکھا۔ یہاں تک کہ یہ جداگانہ اسلوب عنوانات کے اعتبار سے منفرد طرز نگارش کا علمبردار قرار پایا۔ اردو تذکرہ نگاری کی ابتداء اور ارتقاء کا جائزہ لیا جائے تو یہ محسوس کیا جاسکتا ہے کہ تذکرہ کا فن اگرچہ

ابتدائی طور پر شخصیات و حالات کے ذکر کے لیے مختص رہا لیکن رفتہ رفتہ اس طرز تحریر میں نمایاں فرق محسوس کیا جانے لگا اور پھر تذکرہ نگاری کی مختلف اقسام اور متبدلہ اسلوب سے وابستہ ہوگئی۔

تذکرہ کا فن صاحب شخصیت کی زندگی کے حالات اور کارناموں کے پیش کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ جس میں تحقیقی اور استدلالی اصول کی کمیابی بری طرح کھٹکتی ہے۔ اور جب یہی تذکرہ شخصیت کے کارناموں اور حالات کو پیش کرتے ہوئے تحقیق اور حقائق پسندانہ طرز نگارش سے قربت حاصل کرتا ہے تو سوانح حیات کو BIOGRAPHY کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ جب سوانح حیات کی تحریر میں خود کی زندگی کا عکس ذاتی قلم سے رونما ہو تو ایسی تحریر "خود نوشت سوانح" یا AUTOBIOGRAPHY کہلاتی ہے۔ جس میں ایک شخص اپنے حالات زندگی اپنے قلم سے پیش کرنے کی جسارت کرتا ہے۔ اگر اس فن تحریر میں حافظہ پر زور دے کر بکھری یادوں کو سوانحی شکل دی جائے تو یہ انداز یادداشت نگاری (REMINISCENCE) کہلاتا ہے۔ عام طور پر روزمرہ حالات تحریر کر کے اسے مبسوط کتاب کی شکل دے دی جائے تو یہ انداز روزنامچہ DIARY کہلائے گا۔ انسان کی زندگی کے حالات بیان کرتے ہوئے سفر کی دشواریوں اور حالات سفر کا ذکر کسی تحریر کی خصوصیت قرار پائے تو اس انداز کو سفرنامہ TRAVELOGUE کہا جائے گا۔ قدیم تحریروں میں کسی فرد کا ذکر یا فنی طور پر کسی اہم واقعہ کی جانب اشارہ ہو تو یہ انداز ملفوظ نگاری GOSPELS کہلاتا ہے۔ اسی طرح انسان اپنے غمزدہ حالات کا ذکر کسی کے روبرو کرے تو اس طرز و انداز کو سرگزشت کہا جائے گا۔ اس طرح تذکرہ نگاری کا فن سات مختلف اندازِ تحریر کا نمائندہ ہے۔ جس کو فن اور اصول کی روشنی میں درج کیا جاتا ہے۔

۱۔ سوانح نگاری BIOGRAPHY

۲۔ خود نوشت سوانح نگاری AUTO BIOGRAPHY

۳۔ یادداشت نگاری (REMINISCENCE)

۴۔ روزنامچہ (DIARY)

۵۔ سفرنامہ TRAVELOGUE

۶۔ ملفوظات نگاری GOSPELS

۷۔ سرگذشت UTTERANCE

سوانح نگاری

انسان کی زندگی کا جائزہ تاریخ اور عہد کی روشنی میں پیش کرنا ادبی بنیادوں پر خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ عام طور پر جب کسی انسان کی زندگی کو بحث کا موضوع بناتے ہوئے انسانی زندگی کے اہم مواد کو بیانی شکل دی جائے تو یہ اظہار ادب میں "سوانح نگاری" کہلاتا ہے۔ سوانح نگاری نہ صرف ایک مکمل صنف ہے بلکہ دورِ جدید کی سب سے کامیاب طرزِ تحریر کا درجہ رکھتی ہے۔ ادبی طور پر اردو نثر میں سوانح نگاری کا سلسلہ تذکرے سے جا ملتا ہے یعنی اردو ادب میں سب سے پہلے انسان کی زندگی اور اس کے حالات کو تحریری روپ دینے کے لیے تذکرہ نگاری کا رواج ہوا۔ اس لحاظ سے سوانح نگاری اردو تذکرہ کی ترقی یافتہ اور قابلِ قبول صنف ہے جس نے نہ صرف تذکرہ کی قدامت کو موہوم کر دیا بلکہ اپنے پس منظر میں تحقیقی مواد اور سائنسی استدلال رکھنے کی وجہ سے اردو میں تذکرہ نگاری کی صنف معدوم ہونے لگی اور سوانح نگاری نے عام شہرت حاصل کر لی۔ لیکن اردو کا نقاد اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ اردو ادب کی قدیم صنف تذکرہ کو جدید لوازمات سے آراستہ کر کے اسے دورِ جدید میں سوانح نگاری کے فن سے موسوم کیا جانے لگا۔ اس اعتبار سے سوانح نگاری بنیادی طور پر تذکرے کے فن سے استفادہ کرتی اور اسی فن کی ایک مستبدلہ صنف ہونے کا درجہ رکھتی ہے۔

سوانح نگاری کسی شخصیت کی داستانِ حیات کو قلمبند کرنے کا ایک

ایسا طریقہ ہے جس میں پیدائش سے لے کر موت تک کے حالات کو مبسوط شکل دے کر زمانے کے تغیرات، معاشرے کی زبوں حالی اور رسم و رواج کے ردّ و بدل کا شخصیت پر اثر بتایا جاتا ہے یا پھر شخصیت کی وجہ سے زمانہ میں رونما ہونے والے تغیرات کو تاریخ اور عہد کے ساتھ بیان کرنا سوانح نگاری کہلاتا ہے یعنی اس فن کے ذریعہ ایک انسان کی زندگی کو دور اور عہد کے بند حصوں میں باندھ کر شخصیت کے زمانہ پر تغیرات اور انقلابات کے شخصیت پر اثرات سے بحث کی جاتی ہے۔ اور انسانی حیات کو قابل قبول بنانے کے لیے شخصیت کے اخلاق و کردار کو بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے سوانح نگاری ایک ایسی صنف نثر ہے جس کے ذریعہ شخصیت کی حیات کو تحریری شکل دی جا کر اس کی زندگی کے قیمتی واقعات کو اصول پسند زندگی کا مظہر بنایا جاتا ہے۔ سوانح عمری اسی وجہ سے قیمتی صنفِ سخن ہے کہ اس کے ذریعہ تاریخ، شخصیت کردار، سیرت اور فطرت کی بھرپور نمائندگی ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دورِ جدید میں سوانح نگاری کے فن کو انسانی حیات کی پیش کشی کا معیار سمجھا جاتا ہے۔ فن سوانح نگاری کے بارے میں مختلف نظریات پائے جاتے ہیں۔ اس فن کی تعریف کرتے ہوئے کہا گیا ہے۔

"سوانح عمری تاریخ کی وہ شکل ہے جو انسانی نسلوں اور گروہوں سے نہیں بلکہ افراد سے متعلق ہے یا یہ کہ سوانح عمری ایک انسان کی پیدائش سے موت تک کے افکار و افعال کا بیان ہے یعنی حقائق کے ساتھ کردار اور ذہن کی نشو و نما کا مرقع ہے۔ انسان کی شخصیت کی تصویر ہے اور داخلی احساسات کی کہانی ہے۔ آکسفورڈ ڈکشنری میں اس کی تعریف یہ ہے کہ سوانح عمری بطور ایک ادبی صنف کے افراد کی زندگی کی تاریخ ہے کہ اس میں تین لوازم تاریخ، فرد اور ادب بتائے گئے ہیں" ؎۱

؎۱ "Dictionary of world literature by Joseph T. Shiply Article "Biography"

کارلائل کے نزدیک "سوانح عمری ایک انسان کی حیات ہے اسی طرح ایک اور تعریف میں کہا گیا ہے کہ "سوانح عمری ایک انسان کی تاریخ ہے۔" ان تعریفات سے پتہ چلتا ہے کہ سوانح نگاری بنیادی طور پر کچھ اصولوں کی پابند اور نظریاتی قیود کی بنا ئندگی کرتی ہے۔ یہ فن مذہبی، اخلاقی، تاریخی اور سائنسی سوانح عمریوں کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔

سوانح نگاری کا موضوع غیر معمولی قوتِ اظہار اور عظمت کا متلاشی ہوتا ہے یعنی سوانح نگاری نہ صرف موضوع کے اعتبار سے غیر معمولی اظہار کی قوت کو پسند کرتی ہے بلکہ شخصیت کے اوصاف حمیدہ اور شخصیت کی عظمت کو بھی بحث کا موضوع بناتی ہے اسی لیے سوانح نگاری کو عظیم شخصیتوں کے موضوع کردار اور کارنامے کا مرکب کہا جاتا ہے جس میں آنے والی نسلوں کی دلچسپی کو متحرک کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس تحریک کی صلاحیت کو واضح کرنے کے لیے فن سوانح نگاری کامل طور پر موضوع، مواد اور بیان کی ضرورت کی متلاشی ہوتی ہے۔[۱]

اس فن میں صرف عظیم شخصیت کی جسامت کو موضوع بحث نہیں بنایا جاتا۔ بلکہ لطیف و نازک احساسات، ہمدردانہ جذبات، زندگی کی پر معنی مسرت اور عملی زندگی میں پیش آنے والی مشکلات اور جدوجہد کا ذکر بھی کیا جاتا ہے۔ مجموعی اعتبار سے سوانح عمری عوامی زندگی اور نجی تعلقات کو پیش کرنے والی ایک ایسی تحریر ہے جس میں شخصیت کے حالات اور اس کی زندگی میں پیش آنے والے تمام واقعات کو کتابی شکل دی جاتی ہے۔ اسی لیے سوانح عمری کو "از جھولا تا ڈولا" تمام اہم واقعات کو پیش کرنے کا فخر حاصل ہے۔ اس طرح سوانح عمری کا فن شخص کی زندگی کی ابتدا سے آغاز کے مراحل طے کرتا ہوا اس کی موت پر اختتامی درجہ کو پہنچتا ہے۔ اس فن میں شخصیت کی حیات کو پیش کرنے والا اپنی تحریر اور اپنے منفرد اسلوب سے فن کو مکمل طور پر ادبی بنا دیتا ہے یعنی سوانح نگاری کے فن میں صرف عظیم شخصیت کی زندگی اور کارناموں ہی کو اہمیت حاصل

---

[۱] اردو میں سوانح نگاری از سید شاہ علی ص ۱۱

نہیں ہے بلکہ تخلیق کار کی فنی صلاحیت کو بھی خاص دخل ہوتا ہے۔ اس فن میں سوانح نگار جس قدر انفرادی ذہنیت کا حامل ہوگا اسی قدر کامیابی کے ساتھ اپنے فن میں نکھار پیدا کر سکے گا۔ اس لحاظ سے سوانح نگاری شخصیت کے کارناموں اور اس کی خدمات کا ایک ایسا اعتراف ہے کہ جس میں شخصیت کی حیات تحریر کرنے والا اپنی زبان دانی کی خصوصیت کو بھرپور صلاحیتوں سے اس فن کی زینت بناتا اور اس کی خدمات کا اعتراف کرتا ہے اس طرح فن سوانح نگاری ایک فنکار کے قلم سے نکلی ہوئی ایسی موزوں تحریر ہے جس میں عظیم شخصیت کے حالات پیدائش سے لے کر موت تک کے ماحول میں رقم کیے جاتے اور زمانے و عہد کے پس منظر میں اس کی خدمات کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ سوانح لکھنے کے بارے میں شخصیت کے انتخاب کو ضروری قرار دیتے ہوئے لکھا گیا ہے۔

"حیاتیں جو لکھی جانی چاہئیں وہ ہیں جن کے بارے میں دنیا نے نہ کبھی سنا ہے نہ سوچا ہے جو پھر بھی اس کا سب سے زیادہ کام کر رہی ہیں اور جن سے ہم سیکھ سکتے ہیں کہ کام کرنے کا بہترین طریقہ کیا ہے۔"[1]

سوانح نگاری کے لیے عظیم شخصیت کے انتخاب سے مراد صرف عہدہ یا رتبہ بڑائی نہیں ہے بلکہ ایسی شخصیتوں کو عظیم خیال کیا جائے گا جنہوں نے انسانیت کی فلاح کے لیے کام کیا ہو۔ اور اپنی زندگی کے ذریعہ ایسی مہمات اور ناقابل تسخیر مسائل کو حل کیا ہو جن سے انسانیت کی فلاح ہوئی ہو۔ ایسی شخصیتیں عظمت کے قابل ہیں اور ان کی زندگی پر مبسوط کتاب تحریر کرنا سوانح نگاری کے فن کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس اعتبار سے سوانح نگاری کے فن کے لیے پر عظمت شخصیت کا انتخاب بھی ضروری ہے۔ اس کے لیے کوئی ضروری نہیں کہ جس شخصیت پر سوانح نگاری کا فن اس کی حیات اور کارناموں کو پیش کرتا ہے وہ ساری دنیا کے لیے جانا پہچانا ہو دنیا میں کم شہرت یافتہ انسانوں کی زندگی کے بارے میں سوانح نگاری کا فن اختیار کیا جا سکتا ہے

[1] اردو میں سوانح نگاری از سید شاہ علی صفحہ ۱۹

انسان کی زندگی کا جائزہ اور حیات و ممات کا تذکرہ اس کے علاوہ زندگی میں پیش آنے والے واقعات اور زندگی کے ساتھ ساتھ چلنے والی خوش حالی اور بد حالی کا ذکر سوانح عمری کے فن کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ کارناموں کے ذکر کے علاوہ سوانح نگاری کے ذریعہ انسانی زندگی کی شخصی مرقع کاری اور شخصیت کے ہمہ جہتی پہلو کا جائزہ بھی سوانح عمری کے فن میں داخل ہے۔ سوانح حیات کی فنی خصوصیت کو واضح کرتے ہوئے انسائیکلو پیڈیا میں لکھا ہے

A narrative which seeks, consiciously and artistically, to recal the action and reereate the personality of an individual life. Unlike history it deals with the individual, unlike fiction it resords a life that actually has been lived. At the same time the biogrpher shars with the historian a concern for truth and he shares with the novelist the ambition to create a work of art. Thus the great biographies of the world are those which have presented their subjeets as they were but which have gone beyond the more cold action of facts to the creation of a

living portrial. Biography is of peremial interest, partly because it deals with famous or notorious or interesting personalities, But more importantly because its subject matter is human nature. Hence biography is an art may legitimatly deal with any individual life, no matter how humble provided it is made the vehicle for a penetrating analyses of human passions and human motive, it is in such biographies that Samuel Jhonson saw the greatest value, those which tell not how any man because great, but how he was made happy, not how he lost the favour of his prince but how he became discontended with hemself (Idler 84)[1]

---

[1] انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا جلد سوم ص۴۳۶

شخصیت کی سچائی اور حقائق کا انتخاب اور اس کے علاوہ زندہ کارنامو کی اہلیت رکھنے والے کردار کو خصوصی دلچسپی کے ساتھ ضبط تحریر میں لانا اور اس کی خصوصیات کی وضاحت کرنا فن سوانح نگاری کی تعریف میں داخل ہے اسی طرح سوانح حیات میں انفرادی خصوصیات اور شخصیت میں تحو پانے والی عالمانہ ذہنیت کے بیان کو بھی اس فن میں داخل کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے سوانح نگار بیک وقت نہ صرف مورخ کی خصوصیت کو سوانح نگاری میں شامل کرتا ہے بلکہ ناول نگار کی طرح منفرد اسلوب کے ذریعہ سچائی اور شخصیت کے اندر سربستہ رازوں کو بھی افشا کرتا ہے۔ انسان جس طرح زندگی گذارتا ہے اسی انداز سے ضبط تحریر میں لانا سوانح نگاری کی اہم ضرورت ہے۔

سوانح حیات کے موضوع کے لیے ضروری نہیں ہے کہ صرف نامور اشخاص کی زندگی ہی کو تحریری نمونہ بنایا جائے بلکہ ان تمام شخصیات کی زندگی کو ضبط تحریر میں لایا جا سکتا ہے جو معزز ہوں یا بدنام۔ لیکن ان کی زندگی دلچسپیوں سے بھرپور رہے تو نہ صرف ان کی سوانح حیات لکھی جا سکتی ہے بلکہ اس فن کے ذریعہ ان کی زندگی کے واقعات کو بھی ابھارا جا سکتا ہے۔ سوانح نگاری کا مرکزی موضوع انسانی فطرت قرار پاتا ہے جس کے ذریعہ انسانی جذبات احساسات، اور خیالات کی ترجمانی کے علاوہ شخصیت کا تجزیہ اور اس کی تحلیل و ترکیب بھی واضح کی جاتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ سوانح نگاری کے ذریعہ خاکساری منکسر المزاجی۔ طبیعت کا گھمنڈ پن اور اس کے جائز و ناجائز کارنامے بیان کرتے ہوئے شخصیت اور کردار کے علاوہ سیرت کی عکس کشی بھی کی جاتی ہے مجموعی اعتبار سے سوانح حیات کا فن شخصیت اور کردار کے علاوہ سیرت کے اطراف گھومتا ہے۔ جس کے ذریعہ انسان کے کارنامے کو شخصی زندگی اور عوامی زندگی کا محاکمہ

کرتے ہوئے زندگی کے مختلف روپ کو تحریری طور پر پیدائش اور وفات کی بندھنوں میں جکڑ دیتا ہے جو نہ صرف انسانی اقدار کی نمائندگی کے علاوہ اخلاقی و روحانی معاملات کی عقدہ کشائی بھی کرتے ہیں اور اسی عمل کو فنی طور پر سوانح نگاری کا معیار سمجھا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے سوانح نگاری اخلاقی۔ روحانی اور فطری اقدار کی پابند انسانی شخصیت، کردار اور سیرت کا ایک ایسا اظہار ہے جس میں انسانی شخصیت اور اس کے کارناموں کا ایک ایک عمل واضح ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ایسی تحریر جو غیر فرد کے قلم سے نمودار ہو اور جس میں پیدائش سے لے کر وفات تک کے حالات درج ہوں اور جس کے ذریعہ شخصیت کا ہر پہلو واضح ہو جائے اور ایسے فن کو تحریری شکل دیدی جائے تو اسے سوانح نگاری کا نام دیا جائے گا۔

سوانح حیات کی تحریر کے لیے مواد کی فراہمی بھی بڑی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ صاحب شخصیت کی تحریروں، تقریروں اور تصانیف سے اس معاملہ میں کام لیا جاتا ہے۔ لیکن انہیں جمع کرنا ہی سوانح کا اصول نہیں قرار پا سکتا۔ بلکہ صاحب شخصیت کی دماغی کیفیت آرزوئیں، جبلی اظہار اور احساس اس کے علاوہ سوانح سے متعلق بھی مواد فراہم کرنا سوانح نگاری کے اصول میں داخل ہے صرف شخصیت کی حیات لکھ لینا ہی سوانح عمری نہیں کہلاتی بلکہ زندگی کی کشمکش اور جذباتی اور غیر جذباتی رویے کے علاوہ انسانی قوت فیصلہ کے عمل کو بھی سوانح نگاری میں شامل کیا جاتا ہے۔ ان تمام معاملات کو پیش نظر رکھتے ہوئے سوانح حیات لکھنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سوانح نگار کو پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے اور جب تک کوئی شہادت موجود نہ ہو وہ اپنے قلم کو اپنی مرضی سے استعمال نہیں کر سکتا سوانح نگار کا انداز مورخ کی خصوصیات کے علاوہ ناول نگار کی جدت کو فن سوانح نگاری میں شامل کرتا ہے جس کی وجہ سے سوانح نگاری ایک مستند تصنیفی حیثیت حاصل کر لیتی ہے۔

سوانح نگاری کی ضرورتیں اور اس فن کی تحریر کے لیے شرائط کے بارے میں مختلف مکاتب خیال پائے جاتے ہیں۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ سوانح عمری کسی شخصیت کا مختلف زاویوں سے جائزہ لینے کا عمل ہے جس کے ذریعہ شخصیت کو سماج میں ہیرو کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔ سوانح عمری کی ضرورت کے بارے میں لکھا گیا ہے۔

"سوانح نگاری کے لیے چند شرائط ضروری ہیں اول یہ کہ سوانح نگار اپنے فن سے پوری طرح واقف ہو دوسری یہ کہ سوانح نگار زمانہ کے بدلتے ہوئے مذاق کے مطابق شخصیت کے ان عناصر پر زور دے جو قارئین کی نگاہ میں اہمیت رکھتے ہوں۔ تیسری یہ کہ سوانح نگاری کے ذریعہ شخصیت نگاری کا فن ترقی کرسکے۔ بظاہر یہ شرائط کچھ ایسی اہم معلوم نہیں ہوتیں۔ بعض لوگ تو بغیر کسی فنی آگاہی کے صرف اپنے جوہر قابل پر اعتماد کرکے سوانح نگاری کرتے آئے ہیں۔ لیکن ان کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ نادانستہ طور پر وہ ان اصولوں پر کاربند رہے ہیں...... کسی ہیرو کا حال بیان کرنے میں یہ لحاظ رکھا جاتا ہے کہ اس کے کارہائے نمایاں پر زور دیا جائے۔ اس کی زندگی کے ان لمحات کا حال تفصیل کے ساتھ بیان کرنا لاحاصل ہوگا جن میں وہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں لگا رہا ہو یا ایسے غیر ضروری کاموں میں مصروف رہا ہو جن کے بیان سے قاری کو کوئی فائدہ نہ پہنچے۔ جو لوگ خود اپنے حالات یا دوسروں کے سوانح ایک خاص نقطۂ نظر سے بیان کرتے ہیں اور اس نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر اپنی یا دوسروں کی شخصیت کے خدوخال نمایاں کرتے ہیں وہ سوانح نگاری کے فن سے واقف ہوتے ہیں۔ سوانح نگاری ایک بڑی ذمہ دار صنف ادب ہے۔ جن میں شخصیتوں کی سوانح ماڈل یا نمونہ بنا کر دنیا کے سامنے پیش کیے

جائیں ان میں ذاتی کوئی بات بھی ایسی ہونی چاہیے کہ پڑھنے والے کو احساس ہو کہ اس شخصیت کا مطالعہ کرنا ناگزیر ہے۔ یہی شخصیتیں ہمارے سماج میں ہیرو بن کر ابھرتی ہیں۔ ان کا میدان عمل خواہ سیاسی ہو یا سماجی یا ادبی۔

مجموعی اعتبار سے سوانح نگاری کے ذریعہ شخصیت نگاری کا عروج ہوتا ہے۔ اور ایسی سوانح جس کے ذریعہ شخصیت کی غلطیاں اور کوتاہیاں بھی بیان کی جائیں ان سے قاری نہ صرف سامان عبرت و بصیرت حاصل کرتا ہے بلکہ ان خامیوں سے گریز برت کر اپنی زندگی کو کامرانی کے دھارے تک پہنچا سکتا ہے۔ اگر سوانح نگاری میں غلطیاں اور کوتاہیاں بیان نہ کی جائیں تو اس فن سے انصاف نہ ہوگا۔ سوانح نگار مصروف شخصیتوں کو ہیرو بنا کر ان کی پرستش کرنے کا نام نہیں ہے۔ بلکہ صاحب شخصیت کی عظمت کو پوری طرح سمجھانا اور اس کی شخصیت کی خوبیاں اور خامیاں بیان کرکے قارئین میں کوتاہیوں اور بلندیوں کا پورا احساس دلانا ہی سوانح نگاری کے شرائط اور ضرورت میں داخل ہیں۔ اگر سوانح نگار اپنی تحریر کے ذریعہ قارئین میں خوبیاں اور خامیاں پرکھنے کا شعور نہ پیدا کر سکے تو ایسی سوانح ناکام ترین قرار دی جائے گی۔

خودنوشت سوانح

انسان کی خود بینی فطرت اور اپنی خوبیوں بیان کرنے کی صلاحیت ادب میں نئے اظہارات اور اسلوب کا ذریعہ بنتی ہے۔ چنانچہ حالات اور کیفیات کے پس منظر میں سیرت و شخصیت کے کامیاب ابلاغ اور شخصی زندگی ابھارنا خودنوشت سوانح کہلاتا ہے۔ درحقیقت خودنوشت سوانح عمری انسانی زندگی کے اعترافات کا بذات خود تحریر کردہ ایسا اعمال نامہ ہے جس کے ذریعہ انسان اپنے حالات زندگی خود کے قلم سے تحریر کرتا اور اپنی زندگی کے واقعات کو سوانحی روپ دیتا ہے۔ خودنوشت سوانح عمری، شخصی اوصاف اور جذبات و احساسات

ترجمانی کا ایسا نمونہ ہے جس میں ایک انسان اپنی زندگی کی خصوصیات کا جائزہ پوری صحت، ایمان داری، عملی تجربے اور احتساب کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ یعنی خودنوشت سوانح عمری، انسان کی اپنی زندگی کی خوبیوں اور خامیوں کا ذاتی اظہار ہے۔

بیان کے ذریعہ اپنی ذات اور خصوصیات کے بارے میں اظہارات اور خیالات کے سوانحی روپ میں قلم بند کرنا خودنوشت سوانح عمری کی تعریف میں یعنی خودنوشت سوانح کے ذریعہ انسان اپنی شخصی زندگی کے حالات کو تحریری شکل دے کر اپنے قلم سے اپنی زندگی کے واقعات محفوظ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جس سے نہ صرف مصنف کی علمیت کا اظہار ہوتا ہے بلکہ انکشاف ذات کے علاوہ مصنف کے خدوخال اور شخصیت کا عکس پوری طرح واضح ہوجاتا ہے۔ خودنوشت سوانح میں طرز بیان کے علاوہ ایک خصوصیت یہ بھی پائی جاتی ہے کہ اس طریقہ اظہار میں پیدائش اور موت کے درمیانی واقعات کو زندگی کا لازمہ تصور کرکے انھیں انکشاف ذات کی بندشوں میں پابند کیا جاتا ہے جو نہ صرف شخصیت کے وسیع مظاہر کا ذریعہ ہے بلکہ طور و طریق کے علاوہ ظاہری قیود کی پابندی میں شخصیت کی دل چسپی کی بہترین تحریک بھی ہے اس اعتبار سے خودنوشت سوانح عمری خود پروری اور آزاد پسندی شخصیت کی حیات کا ایک ایسا اظہار ہے جس کے ذریعہ زندگی کی نشوونما اور اس کی ترتیب و تنظیم کا عکس نمایاں ہوتا ہے۔ یعنی خودنوشت سوانح کے ذریعہ ایک انسان کی زندگی کے مکمل حالات مبسوط شکل میں اس کی تحریر کے ذریعہ واضح ہوتے ہیں۔ جس کی وجہ سے خودنوشت سوانح ایک اہم ترین سوانحی دستاویز بن جاتی ہے۔

اپنا نگاہوں کو اپنے آپ پر منعطف کرکے اپنی شخصیت کی مختلف حقیقتوں کو آشکار کرنا خودنوشت سوانح عمری میں داخل ہے۔ دنیا کے تمام مسائل انسان کی ذات کے متعلق ہوتے ہیں اور حالات کے پس منظر میں شخصی اظہار کا ذریعہ تلاش کرتے ہیں۔ ان تمام کو

اپنی زندگی کے اعتراف کے طور پر پیش کرنا "خود نوشت سوانح" ہے۔ اس خصوص میں ناقدین نے اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"آپ بیتی لکھنے والا کم سے کم مورخ کی پہلی شرط یعنی سچائی کے علم کو پورا کرتا ہے اور گو تصنع اور بناوٹ کا گمان ہو سکتا ہے لیکن ایک آپ بیتی لکھنے والے سے بھی غیر جانب داری کی اتنی ہی توقع کی جا سکتی ہے۔ جتنی کسی سوانح نگار سے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ معلوم باتوں میں اپنے ضمیر کا گلا گھونٹے بغیر غلط بیانی نہیں کر سکتا۔ اس کا واحد مقصد خود پرستی ہو سکتا ہے۔ جسے چھپایا نہیں جا سکتا۔"[1]

اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ خود نوشت سوانح عمری، انسان کی خود پرستی کے جذبے کی نمائندہ ہے۔ جس کے ذریعہ خود نوشت سوانح نگار سچائی کو پیش کرنے کی مکمل کوشش کرتا ہے۔ اور اپنے عمل سے غیر جانب داری بھی روا رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود نوشت سوانح انسانی زندگی کی ذاتی تحریروں کا نتیجہ بن جاتی ہے۔ جس کے بارے میں جانسن لکھتا ہے:

"خود نوشت سوانح عمری ایک سخت دشوار اور قوت فیصلہ کو متزلزل کر دینے والی چیز ہے اور وہ ایمان داری، تجزیاتی نظر، خود آگاہی اور واقعیت پسندانہ دیانت داری سے عاری ہو سکتی ہے۔ مزید برآں سب سے زیادہ عقلمند یا ایمان دار کے لیے بھی پردہ داری، ترمیم و اضافہ یا مبالغے کے وجوہ ہو سکتے ہیں"۔[2]

---

[1] اردو میں سوانح نگاری از سید شاہ علی ص ۶۸

[2] " " " ص ۷۵۔۷۴

نفس انسانی بے ہنگم مقاصد، بے ڈھنگی خواہشات، ہیجانات اور اشتہاؤں وغیرہ کا ایک عجیب سیّال آتشیں اور جاندار مرکب ہے۔ جس کا ایک اگر ٹھوس بطون ہو بھی تو وہ سراب آسا اور سیماب صفت ہے۔ جس کی ہر تہہ پیاز کے چھلکے کی طرح موقتی طور پر آخری معلوم ہوتی ہے۔ جبکہ خودنوشت سوانح، زندگی کے مختلف ادوار کے حالات پیش کرنے کی نمائندہ ہے۔ انسانی فطرت کے مختلف گوشوں کی سیال حالت کو مربوط شکل دے کر اپنے دل کو آئینہ دکھانے کی ذمہ دار قرار پاتی ہے۔ خودنوشت سوانح، ایک انسان کے واقعات زندگی کا بیان ہے جس کے ذریعہ انسان اہم ترین واقعات کا انتخاب کر کے حافظہ کی بنیاد پر انھیں تحریر کرتا ہے جس کے بارے میں اکثر کہا جاتا ہے۔

خود نوشت سوانح عمری میں بھی واقعات زندگی کا انتخاب ضروری ہے ورنہ اگر جیمس جوائس کے مشہور تاریخی فردیولیس کی ایک دن کی مصروفیات کو فرضی پیرائے میں بیان کے لیے آٹھ صفحات ناکافی ہیں تو کسی کی زندگی کے ہزاروں دنوں کے بیان کے لیے کتنے دفتر چاہئیں۔ اسپنسر نے اسی لیے صرف نمایاں خدوخال کے انتخاب کو مبالغہ آمیز جانتے ہوئے بھی ضروری قرار دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ روزمرہ کے معمولی مشاغل کا خوف لازمی ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے انسانی محسوسات، افکار، اقوال اور افعال ہنگامی ہوتے ہیں اور زندگی کے اصل دھارے پر ان سے کوئی نتیجہ مرتب نہیں ہوتا۔“ [۱]

اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ خودنوشت سوانح عمری میں روزمرہ

---

[۱] اردو میں سوانح نگاری از سید شاہ علی صفحہ - ۴۲

کے مشاغل و افعال سے زیادہ زندگی کے اصل دھارے سے متعلق مواد کی ترتیب پر توجہ دی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے خودنوشت سوانح عمری کے پلاٹ میں اتحاد پیدا ہوتا ہے اور یہ فن متحد اور مربوط شکل میں ادبی انداز کا نمائندہ ہو جاتا ہے۔ اس فن میں قوت حافظہ کی شعوری کیفیت کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یعنی خودنوشت سوانح عمری کا مکمل انحصار یاد رکھنے کی قوت پر ہوتا ہے۔ اسی لیے یہ فن بسا اوقات دھندلے اختلافات سے مربوط ہو جاتا ہے۔ عام طور پر خودنوشت سوانح عمری میں بچپن کا بیان سرسری اور غیر مستند ہی ثابت ہوگا کیونکہ چند ضمنی یادیں جو چھ سات برس میں وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ ان کی تشریح حافظہ کی بنیاد پر مکمل نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ خودنوشت سوانح لکھنے والا کتنا ہی پرخلوص کیوں نہ ہو بچپن کے بیان میں مبالغہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ عام طور پر جنگ اور انقلابی جدوجہد کے دوران بسر ہونے والا بچپن بہ نسبت ایک خاموش اور خوش حال بچپن کے زیادہ یاد رہتا ہے۔ اسی لیے بچپن کے بیان کو مکمل طور پر غیر مستند نہیں قرار دیا جا سکتا۔ بعض اوقات بچپن کے حالات کے بارے میں انسانی حافظہ ایک درجہ پیچھے رہ جاتا ہے۔ جس کی تکمیل کے لیے اس دور کے بزرگوں کے بیانات کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ خودنوشت سوانح عمری کسی حد تک واقعات کے بیان میں یادداشت کے سہارے بھی فن کی نشوونما کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ خودنوشت سوانح کے فن میں یادداشت کا بہت بڑا دخل ہوتا ہے۔ اس کے باوجود خودنوشت سوانح مکمل طور پر یادداشت پر بھروسہ نہیں کرتی بلکہ بہت سے خودنوشت سوانح نگار اپنے حافظہ کے علاوہ تحریری وسائل پر بھی تکیہ کرتے ہیں جس کے ذریعہ پورے سلسلہ کو یاد کرنا ممکن اور آسان ہو جاتا ہے۔

خودنوشت سوانح نگاری کے درمیان حافظہ اور یادداشت کی اہمیت

کو ثابت کرتے ہوئے پلوٹینس plutanuus لکھتا ہے کہ "حافظہ، تاثرات کا دفینہ نہیں ہے بلکہ یہ روح کی خود کو متحرک کرنے کی قوت ہے جس سے اُسے وہ چیز حاصل ہو جاتی ہے جو اس کے پاس نہیں تھی۔ حافظہ تخلیق بھی کرتا ہے اور امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ ترمیم و اضافہ بھی کرتا جاتا ہے"۔ [1]

خود نوشت سوانح میں یادداشت اور حافظہ کی قوت کی وجہ سے تخلیقی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض خود نوشت سوانح عمریاں، تخلیقی ادب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ قوتِ حافظہ کی اس ضرورت کے اظہار سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ خود نوشت سوانح نگاری کے فن کو ارتقاء کے مراحل میں پہنچانے میں قوت حافظہ بہت بڑی مددگار ہے۔ جس کی وجہ سے خود نوشت سوانح نگار اپنی زندگی کے حالات اور جزئیات کو اعتماد کے ساتھ تحریری شکل دیتا ہے۔ اس فن میں مکمل طور پر پوری شخصیت کے اظہار کے امکان کی توقع پر توجہ دی جاتی ہے۔ جس کے لیے قوتِ حافظہ اور یادداشت بہترین سہارے کا کام انجام دیتے ہیں۔

شوق نمود و نمائش اور مبالغہ آمیزی بھی خود نوشت سوانح عمریوں میں کسی حد تک اپنا اثر دکھاتے ہیں۔

"عام طور پر خود نوشت سوانح نگار بہ حیثیت ایک آرٹسٹ کے فراریت پسند اور ایک بہتر حیات کا متمنی ہوتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ بہترین خود نوشت سوانح نگار میں ایک خداداد تجزیاتی قابلیت، انتہائی بصیرت دارانہ انسانی ہمدردی کے احساس اور سب سے زیادہ ایک غیر جانب دار اور واقعیت پسندانہ طرز عمل کی ضرورت ہے تاکہ بے تعلقی سے تبصرہ کیا جاسکے"۔ [2]

---

[1] و [2] اردو میں سوانح نگاری از سید شاہ علی ص ۴۵-۴۷

سوانح نگار کی ذہن شناسی اور خود نوشت سوانح کے اصول کی غمازی
کرتے ہوئے یہاں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ خود نوشت سوانح نگاری کا فن صرف شخصیت
کا بیان ہی نہیں بلکہ ایک فنی کارنامہ ہے۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خود نوشت
سوانح پوری شخصیت کے اظہار کے علاوہ مکمل حیات کی پیشکش کی نمائندہ ہے
جس کے ذریعہ حافظہ کو متحرک کر کے تاثرات بیان کیے جاتے ہیں اور امتداد زمانہ
کے ساتھ ساتھ شخصیت میں پیش آنے والے ردوبدل کو تحریری جامہ پہنانے کی
کوشش کی جاتی ہے۔ اس طرح خود نوشت سوانح عمری ایک ایسا فن قرار پاتی ہے
جس کے ذریعہ زندگی کی جزئیات، شخصیت کی حقیقت، جذباتی لغزشوں اور زمانہ
کے ساتھ ساتھ انسان میں پیدا ہونے والے تغیر کے علاوہ حافظہ کی بنیاد پر حالات
اور واقعات کے پس منظر میں ایک انسان اپنی زندگی کا آپ محاکمہ کرتے ہوئے صاف
گوئی کے ساتھ اپنی داستانِ حیات قلمبند کرتا ہے جسے ادبی طور پر خود نوشت سوانح عمری
یا آپ بیتی کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ درحقیقت خود نوشت سوانح عمری پیدائش سے لے کر
تحریر کی حیات تک کے حالات پر مبنی ایک ایسی داستان ہے جسے قلمکار
اپنے قلم سے آپ تحریر کرتا ہے۔

خود نوشت سوانح کے بارے میں عام طور پر یہ پایا جاتا ہے کہ یہ بالواسطہ
یا بلا واسطہ تین چار ہیجانی زمانوں سے منسوب کی جاسکتی ہے اور ہر ایک زمانہ
نمایاں عبوری دور سے منسلک ہوتا ہے جس میں فرسودہ عادات اور جذبات ختم ہوتے
اور نئی عادات وجود میں آجاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی زندگی کے ساتھ ساتھ
خود نوشت سوانح عمری میں مختلف ہیجانی زمانوں کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ یعنی خود نوشت
سوانح نگاری انسانی زندگی کے یکساں اصول پیش نہیں کرتی بلکہ سوانح نگار کی زندگی کے
وہ تمام ردوبدل پیش کرتی ہے جس کے مطابق وہ مختلف سیاسی، معاشی، تمدنی اور

غیر قدرتی مسائل سے دوچار رہتا ہے۔ اس اعتبار سے خودنوشت سوانح، زمانہ کے تغیر و تبدل کے پس منظر میں اپنی شخصیت کا آپ جائزہ لینے کا نام ہے جس کے ذریعہ بنتی اور بگڑتی سیرت کی نمائندگی ہوتی ہے۔ خودنوشت سوانح میں مصنف کی شخصیت اور اس کے اثر کی وضاحت کرتے ہوئے یہ لکھا گیا ہے:

"ہر آپ بیتی اپنی نوعیت کے لحاظ سے مصنف کی شخصیت کی تابع ہوتی ہے اور وہ ایسی ہی نئی، غیر متوقع اور مختلف ہوتی ہے جیسی کہ ایک اجنبی شخصیت! اس کا اسلوب بیان بھی اس شخصیت کا ایک جزو ہوتا ہے۔ لیکن شجرۂ نسب سے ابتدار، بے جا طوالت، تصنیف کے لیے معذرت وغیرہ ایسی باتیں ہیں جو عموماً مشترک نظر آتی ہیں۔ ورنہ یہ کہنا شاید ہی بے جا ہوگا کہ ہر ایک خودنوشت سوانح نگار آپ اپنا آئین ہے۔ چنانچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر ایک خودنوشت سوانح عمری نتیجہ ہے ایک فرد کے دماغی، جسمانی یا مالی بحران اور اس کے باعث رونما ہونے والے محرکات کا۔ جو اس میں یک گونہ تنہائی اور اپنی ذات سے متعلق ہمدردی، صفائی، دادخواہی یا ابلاغ کی ضرورت کا احساس پیدا کرتے ہیں۔ لیکن ان کے ایسے علاحدہ علاحدہ خانے نہیں بنائے جا سکتے کہ ایک دوسرے میں گذر نہ ہو۔" [1]

خودنوشت سوانح نگاری میں سوانح نگار کی ضرورت اور اس کی اہمیت وافادیت کا اظہار کرتے ہوئے اس بیان میں ثابت کیا گیا ہے کہ خودنوشت سوانح نگار اپنے فن میں اظہار کے طریقے کے ذریعہ بذات خود اصول مدوّن کرتا ہے۔ جس سے نہ صرف

---

[1] اردو میں سوانح نگاری از سید شاہ علی ص ۴۸

فرد کی خصوصیت ظاہر ہوتی ہے بلکہ شخص کی سماجی زندگی اور اس کے طرزِ عمل سے بھی واقفیت ہوتی ہے ۔ اس عمل میں خود نوشت سوانح نگار امتیازی خصوصیت اور انوکھے انداز سے لوگوں کی توجہ اپنی جانب منعطف کرانا چاہتا ہے ۔ اس کے علاوہ خود نوشت سوانح نگاری میں فن کار خود کی دریافت پر خصوصی توجہ دیتا ہے جس سے ابلاغ کو نئی راہیں ملتی ہیں اور اس کے انداز سے نئے اسلوب کا آغاز ہوتا ہے ۔ اردو میں سرسید اور غالب کی تحریروں میں یہ عکس ملتا ہے کہ انھوں نے اپنے قلم کے ذریعہ نہ صرف سوانحی مواد کی ترسیل کی بلکہ اپنے انوکھے انداز کے ذریعہ منفرد اسلوب کو بھی رواج دیا ۔ سرسید کی اصلاحی کوشش اور تہذیب الاخلاق کے مضامین ۔ غالبؔ کے خطوط میں کلکتہ کا معرکہ اور قید فرنگ یہ ایسے ابواب ہیں جن میں سرسید اور غالب نے خود نوشت سوانح کے لیے مواد پیش کیا ہے ۔ جس سے خود نوشت سوانح ، فنی دریافت ، داد و دہش اور مسرت کا جذبہ پیدا کرنے والی ایک ایسی طرزِ تحریر ثابت ہوتی ہے جس کے ذریعہ سوانح نگار خود کے حالات کو تحریری شکل دے کر اچھوتے انداز میں بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے ۔

خود نوشت سوانح ، انسانی زندگی کی ایک دستاویز ہے جس میں انسانی زندگی کا تعلق انقلاب ، سیاست ، فنونِ لطیفہ ، ادب ، فلسفہ ، مذہب اور دیگر رموز سے بتایا جاتا ہے ۔ جس کے ذریعہ انسان اپنی شخصی دلچسپی کے سامان کو سوانحی روپ دے کر ادب میں شامل کرتا ہے ۔ غرض خود نوشت سوانح ، انسانی زندگی کی ایسی یادگار روداد ہے جس کے ذریعہ انسان اپنی حیات کو اپنے قلم سے اظہار کا ذریعہ بنا کر اس میں ادبی چاشنی سمونے کی کوشش کرتا ہے خود نوشت سوانح کے فن کے بارے میں تحقیقی مواد پیش کرتے ہوئے انسائیکلو پیڈیا میں لکھا گیا ہے ۔

"Autobiography is literally a man's

recording of his own life. Autobiography documents can be found in all cultures and all ages, but Autobiography as deliberate literary product is brought to existence only under certain conditions.

As a literary form autobiogra- is to be distinguished from then types of self-revelation most closely related to it, the diary, the Journals and the , the dairy is a record of daily experience, the presentation of the day by day process of ones own life, without regards to petterend development, narration contininty, or diamatic movement towards a climex" لہ

یادداشت اور روزنامچہ کی اہم مصروفیات کی شمولیت سوانح عمری کی فنی ضرورت ہے یعنی خود نوشت سوانح عمری کے فن میں اگر ایک انسان اپنے

لہ انسائیکلوپیڈیا امریکانا جلد ۲ صفحہ ۸۳

گذرے ہوئے واقعات کی اپنی مصروفیات اور اپنے عہد کے اہم واقعات شامل نہ کرے تو اس کی تحریر کردہ تصنیف خودنوشت سوانح کی صنف میں شامل نہیں ہوگی خودنوشت سوانح کے لیئے ضروری ہے کہ انسان اپنے حالات ، خیالات کے علاوہ واقعات کو بقلم خود پیش کرے جس کے ساتھ ہی ادب ، مذہب یا سیاست کے علاوہ زمانے کے انقلابات کے تاریخی جز کو بھی تحریر کا لازمہ بنائے۔ ان خصوصیات کی متحمل تصنیف خودنوشت سوانح عمری کہلائے گی ۔ خودنوشت سوانح نہ صرف ادب کا ایک خاص اظہار ہے بلکہ فنی اعتبار سے بھی کافی اہمیت رکھتی ہے ۔ تذکرہ نگاری کی ترقی یافتہ شکل سوانح نگاری کے روپ میں ظاہر ہوئی اور سوانح نگاری نے اپنے اسلوب کو کئی اچھوتے اندازوں سے آشنا کیا جن میں خودنوشت یادداشت ، روزنامچہ اور سفرنامہ اہمیت کے حامل ہیں ۔ خودنوشت سوانح ایک مکمل صنف نہ ہونے کے باوجود بھی اپنے اندر کئی اندازِ تحریر کی خصوصیات رکھتی ہے ۔ تذکرہ اور سوانح کے ذکر کا اختتام صرف خودنوشت سوانح پر نہیں ہوتا بلکہ خودنوشت سوانح خود متعدد قسموں میں تبدیل ہو جاتی ہے ۔ جن میں یادداشت ، روزنامچہ ، سفرنامہ ، ملفوظات اور سرگذشت کو خاص دخل ہے ۔ جن کے بیان میں علیحدہ عنوانات کے تحت بحث کی گئی ہے ۔ اردو میں خودنوشت سوانح فنی اور تاریخی اعتبار سے ۱۸۵۷ء میں مولانا محمد جعفر تھانیسری کی کتاب " کالا پانی " سے عالم وجود میں آئی جو اردو ادب کی پہلی خودنوشت سوانح ہونے کا درجہ رکھتی ہے ۔ اردو میں خودنوشت سوانح کے آغاز کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے علیم الدین سالک تحریر کرتے ہیں ۔

" ہمارے یہاں آپ بیتیوں کا رواج ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد شروع ہوا ۔ جس قدر ملک ترقی کرتا گیا اسی قدر زیادہ آپ بیتیاں لکھی جاتی رہیں ۔ چنانچہ سب سے پہلی آپ بیتی جو اردو زبان میں لکھی گئی وہ مولانا محمد جعفر کی " کالا پانی " ہے ۔ اس میں مولانا محمد جعفر تھانیسری نے اپنی زندگی

کے اس دور کا پورا پورا نقشہ کھینچا ہے جو انہیں جلا وطنی میں بسر کرنا پڑا۔[1]

خود نوشت سوانح ایک ایسی تحریری شکل ہے جس میں انسان کی زندگی سے لے کر دمِ تحریر تک کے حالات درج ہوتے ہیں اور اگر زندگی کے کسی اہم واقعہ کی تفصیل کسی فن میں درج ہو تو وہ آپ بیتی کہلائے گی۔ اس طرح خود نوشت سوانح کا فن کئی طرزِ تحریروں کا نمائندہ ہو جاتا ہے۔ فنّی اعتبار سے خود نوشت سوانح، زندگی سے لے کر دمِ تحریر تک کے حالات کی ایک عظیم سرگزشت ہے جو مصنف کے قلم سے عالمِ وجود میں آتی ہے اور اپنے فن کے ذریعہ زندگی کے مختلف رُخوں کی نمائندگی کرتی ہے۔

سوانح نگاری اور خود نوشت سوانح عمری میں صرف یہی فرق پایا جاتا ہے کہ سوانح عمری کسی انسان کی پیدائش سے لے کر موت تک کے حالات کو قلمبند کرتی ہے۔ جبکہ خود نوشت سوانح، انسانی عمر اور اس کی حیات تک کی کہانی ہے۔ یعنی خود نوشت سوانح، انسانی ذہن کی ایک ایسی کوشش ہے جس کے ذریعہ مصنف اپنی زندگی کے حالات اپنی حیات تک تحریری شکل میں قلمبند کر کے اپنی فنّی خوبیوں سے آراستہ کرتا ہے۔ اس اعتبار سے سوانح عمری زندگی کے تمام ادوار کی نمائندہ ہے۔ اور پیدائش سے لے کر موت تک کے حالات کسی دوسرے فرد کے ذریعہ تحریر کی جانے والی صنف ہے جب کہ خود نوشت سوانح محررانہ خصوصیات کی حامل ہے اور مصنف کے قلم سے اپنی زندگی کے حالات آپ تحریر کرنے کی ایک ایسی کوشش ہے کہ جس میں فنکار اپنی زندگی کے حالات آپ قلمبند کرتا ہے۔ یعنی کوئی بھی خود نوشت سوانح فن کار کی موت کے حالات قلمبند نہیں کر سکتی کیونکہ خود نوشت سوانح نگار اپنی موت کے حالات قبل از موت تحریر کرنے سے قاصر رہے گا اور اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں بھی

---

[1] نقوش، آپ بیتی نمبر جون ۱۹۶۴ء، صفحہ ۵۴

پیش قیاسی نہیں کرسکتا۔ اس طرح خودنوشت سوانح، انسانی زندگی کی ایک ایسی حد ہے جہاں فن کار کا قلم رکے گا وہیں خودنوشت سوانح اختتام کو پہنچے گی۔ جبکہ سوانح عمری، شخصیت اور اس کے کارنامے انسان کی موت کے بعد بھی بیان کرنے کے لیے پوری طرح پابند ہے۔ سوانح اور خودنوشت سوانح کے اس بنیادی فرق کے بعد واضح ہو جاتا ہے کہ تذکرے کے دامن میں پلنے والی سوانح نگاری کی صنف اپنے دامن میں خودنوشت سوانح کو جگہ دیتی ہے جس کے جلو میں آپ بیتی، سفرنامے، ملفوظات، روزنامچہ اور سرگذشت جیسی جدید تحریریں اپنا تاثر دکھاتی ہیں۔ خودنوشت سوانح ایک فعال تحریر ہے جو اپنے اندر دیرینہ خصوصیات کو چھپائے ہوئے فلک ادب پر رونما ہو رہی ہے۔

یادداشت

سوانحی ادب کے آغاز میں جن تحریکات کا شمار کیا جاتا ہے ان میں یادداشت نگاری بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے اس کی حیثیت ایک طرز اسلوب جیسی ہے جس کے ذریعہ انسان اپنی گم گشتہ یادوں کو اکٹھا کر کے تحریری ادب میں محفوظ کرتا ہے۔ "یادداشت" کو صنف نثر کی حیثیت حاصل نہیں ہے بلکہ یہ ایک مشترکہ طرز تحریر ہے جس کے ذریعہ سوانحی واقعات کو محفوظ حالت میں تحریری شکل دے دی جاتی ہے۔ اگرچہ یہ طرز اسلوب، تاریخ، سوانح اور واقعات اور حالات سے متعلقہ ہوتا ہے لیکن اس کا شمار تاریخ میں نہیں کیا جاسکتا بلکہ اسے ادبی شکل دیدی جاتی ہے۔ ادب کی ایک تشکیلی صنف ہونے کی وجہ سے "یادداشت نگاری" فنی اور علمی طور پر سوانحی حیثیات کی حامل اور اردو کی قدیم صنف "تذکرہ نگاری" سے قریب ہے۔

یادداشت کا لفظ فارسی زبان سے اردو میں مروج ہوا۔ جس کے معنی یاد رکھنے کی نشانی کے ہوتے ہیں یعنی یادداشت سے مراد ایسی تحریری نشانی قرار دی جائے گی جو یاد رکھنے کے قابل ہو اور جسے بھلایا جانا ممکن نہ ہو۔ فارسی زبان میں

لفظ "یاد" کا استعمال خاص اہمیت کا حامل ہے جس کے معنی حفظ یا محفوظ کے ہوتے ہیں۔ اسی لفظ "یاد" سے نئی ترکیب "یادداشت" وضع کی گئی اور اس لفظ کے ذریعہ حافظہ پر زور دیکر کسی نشانی کو یاد رکھنے کے مفہوم کی ادائیگی ہونے لگی۔ معنوی اعتبار سے "یادداشت" ایک ایسے مختلف معنی رکھنے والے لفظ کی نشاندہی کرتا ہے جس کے ذریعہ یادوں کو فنّی طور پر محفوظ کرنے کی نمائندگی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ یادداشت اس کیفیت کی نمائندہ ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ یادداشت اس کیفیت کی نمائندگی بھی کرتی ہے جس کے ذریعہ انسان اپنے حافظہ پر زور دیکر گذرے ہوئے واقعات کو یاد کرتا ہے اور اس کے بل بوتے پر اپنی زندگی کی کہانی ترتیب دیتا ہے۔ اس اعتبار سے یادداشت ایسی معنوی حیثیت کی حامل ہے جس کے ذریعہ گذرے ہوے واقعات کو ذہن کی محفوظ حالت سے نکال کر نشاندہی کے طور پر دنیا کے سامنے لایا جاتا ہے۔

فارسی زبان میں یادداشت کا لفظ بھولی ہوئی یادوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ یعنی اگر کوئی انسان اپنے کارناموں میں کسی اہم جزُ کو بھول جائے تو اس کے دوبارہ یاد دلانے کے لیے انسان کے ذہن پر جو بوجھ پڑتا ہے وہ یادداشت کہلائے گا۔ اس کے علاوہ یادداشت کا استعمال گم گشتہ یادوں کو تازگی بخشنے کے لیے بھی کیا جاتا ہے۔ یعنی بھولی بسری خصوصیات اور واقعات کو ذہن میں دوبارہ جگہ دینے کے لیے جو طریقہ اختیار کیا جائے گا وہی یادداشت کا درجہ رکھتا ہے۔

لفظ یادداشت نے فارسی طرز واصل سے اردو میں رواج پایا جو درحقیقت یاد سے مربوط ہے۔ یادداشت مکمل ایک لفظ ہے یہ یاد اور کسی دوسرے لفظ کے ملانے سے نہیں بنا اور نہ اس کی حیثیت مرکب لفظ کی ہے بلکہ یہ مجرد لفظ کا حامل ہے۔ اس کی ترکیب کے بارے میں اتنا کہا جا سکتا ہے کہ یہ لفظ "یاد" سے مشتق ہے لیکن یہ دو حیثیتوں کا حامل نہیں بلکہ اپنی انفرادیت رکھتا ہے۔ لفظ "یادداشت" فنّی طور پر استعمال ہونے سے پہلے

خاص مواقع پر پیش کرنے کے لیے مستعمل رہا۔ اس کے علاوہ آج بھی اس لفظ کا استعمال اعلیٰ افسران اور ذی حیثیت عہدہ دار کی خدمت میں سماجی مسائل کے معاملات کو پیش کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ درحقیقت یادداشت ایک ایسی افادی دستاویز ہے جس کے ذریعہ توجہ دہانی اور معاملات کے حل پر نگاہ کو مرکوز کروایا جاتا ہے۔ یعنی یادداشت کے ذریعہ اہم مسئلہ پر باوقار شخصیت کی توجہ مبذول کروانے اور اس کی شخصیت سے توقعات وابستہ رکھنے کا عمل تکمیل پاتا ہے۔

یادداشت لفظ کے لیے انگریزی میں REMINISENCE مروج ہے جو لاطینی زبان سے انگریزی میں منتقل ہوا۔ یادداشت کا فن انگریزی ادب میں اردو زبان کی طرح مبسوط نہیں۔ اس کے علاوہ اردو ادب میں بھی اسی انداز کی بہت کم کتابیں لکھی گئی ہیں۔ فنی طور پر ذہن پیچھے توجہ ڈال کر گذری ہوئی یادوں کو ضبط تحریر میں لانا "یادداشت نگاری" کہلاتا ہے۔ اردو ادب میں رشید احمد صدیقی کی کتاب "آشفتہ بیانی میری" کامیاب یادداشت نگاری کی نمائندہ ہے۔ جس میں رشید احمد صدیقی نے علی گڈھ مسلم یونیورسٹی سے وابستہ طالب علمی کے زمانے کی یادوں کو جمع کردیا ہے۔ درحقیقت یہ کتاب اُردو نثر میں بہترین یادداشت قرار دی جاسکتی ہے جس کے توسط سے رشید احمد صدیقی نے اردو نثر کو یادداشت نگاری کا اچھوتا اسلوب دیا۔ انگریزی زبان میں مروجہ لفظ REMINI-SENCE کا استعمال یادوں کو اکٹھا کرنے کے لیے عام طور پر ادب میں شامل ہے۔ انگریزی ادیبوں اور شاعروں نے اس فن پر توجہ دیتے ہوئے اپنے گذرے ہوئے تجربات کو حافظہ کے بل بوتے پر تحریر کرنے کا طریقہ اختیار کیا۔ جس طرح اُردو زبان میں "یادداشت نگاری" کا اسلوب کمیاب ہے اسی طرح انگریزی ادب میں بھی اس کی مثالیں گاہے ماہے ملتی ہیں چونکہ خودنوشت سوانح، سفرنامہ، اور یادداشت میں ہلکا سا فرق ہے اس لیے اس اسلوب کو دوسرے فنون سے مختلف کرنا ایک دشوار امر ہے۔ یادداشت نگاری میں تذکرہ کی صفت،

سرگذشت کا انداز، سفرنامہ کا لہجہ، خودنوشت کے اصول، حالات کا ذکر اور سوانحی خصوصیات کا عکس پوری طرح نمایاں ہوتا ہے۔ یہ درحقیقت گذرے ہوئے لمحات کا ایک روزنامچہ ہے جس کے ذریعہ تخلیق کار اپنے قلم کو فنی طور پر ماضی کے واقعات اور حالات کو مستقبل میں نمایاں کرتا ہے یعنی یادداشت نگاری میں فن کار مستقبل کے قلم سے ماضی کا تذکرہ کرتا اور گذرے ہوئے لمحات کو مستقبل کی درخشانی بخشتا ہے۔ اس اعتبار سے یادداشت نگاری ایک ایسا اسلوب ہے جس کے ذریعہ ماضی کے جھروکوں کو مستقبل کے زنداں میں قید کیا جاتا ہے۔

اُردو نثر میں یادداشت نگاری کی طرز اور اس کا اظہار گمنامی سے وابستہ رہا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد سفرنامہ اور خودنوشت سوانح کی ابتداء ہوئی اور محمد جعفر تھانیسری نے کالا پانی لکھ کر خودنوشت سوانح کو فروغ دیا۔ اس طرح ۱۸۴۷ء میں یوسف خاں کمبل پوش نے "عجائبات فرنگ" لکھ کر سفرنامہ کا آغاز کیا۔ لیکن طویل عرصہ تک یادداشت نگاری پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ رشید احمد صدیقی نے سب سے پہلے علی گڈھ کی طالبعلمانہ زندگی کو ضبط تحریر میں لاکر "یادداشت" نگاری کے اسلوب کا آغاز کیا اس طرح اُردو نثر میں اس فن کی ابتداء ہوئی۔

سوانح نگاری اور تذکرہ کی ایک بدلی ہوئی طرز تحریر یادداشت کے بارے میں اکثر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یادداشت نگاری، خودنوشت سوانح کی ایک قریبی شکل ہے۔ لیکن اس فن میں کوئی تفریق پائی جاتی ہے۔ یادداشت کا تعلق سوانح نگاری سے مکمل طور پر نہیں جس طرح تذکرہ نگاری اور خودنوشت سوانح کے ذریعہ صاحب شخصیت کے کارناموں کو ابھارا جاتا ہے۔ اسی طرح یادداشت کے ذریعہ بھی انسانی شخصیت اور سیرت کا عکس پیش کیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں اکثر کیا جاتا ہے:۔

"یادداشت، خودنوشت سیرت کے بہت قریب پہنچ جاتی ہے، بلکہ خودنوشت اور یادداشت کے نام اکثر اس طرح استعمال کیے جاتے ہیں گویا ان کا آپس میں ردوبدل ہو سکتا ہے۔ لیکن ان میں سیرت وکردار اور بیرونی واقعات کو اضافی اہمیت کی مناسبت سے بجا طور پر امتیاز کیا جا سکتا ہے۔ یادداشتوں میں بعض شخصیتوں اور افعال کو جو مصنف سے زیادہ تعلق نہیں رکھتے نمایاں جگہ دی جاتی ہے۔ بعض میں تاریخی واقعات کے بیانات کے علاوہ جو براہ راست لکھنے والے کے مشاہدے میں آتے ہیں شاذ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔" لہ

یادداشت کو خودنوشت یا سوانح نگاری سے مربوط نہیں کیا جا سکتا۔ یہ سفرنامے اور روزنامچے کی طرح ایک علحدہ تحریری شکل ہے جس کا تعلق سوانح نگار کے فن سے قریب کا ہے۔ اس فن میں انسانی سیرت، کردار اور عمل کی یادگار خصوصیت کو یادوں کے سہارے اکٹھا کیا جا کر انہیں تحریری شکل میں واضح کیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے یادداشت ایسی تحریر قرار پاتی ہے جس میں مصنف اپنے مشاہدات اور واقعات کی تحریر کے لیے منفرد اسلوب اختیار کرتا اور اپنے گذرے ہوئے چند قیمتی لمحات کو ضبط تحریر میں لاتا ہے۔ اپنی زندگی کے واقعات تحریر کرنا خودنوشت سوانح نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے ذریعہ انسانی زندگی کا وہ تسلسل جو پیدائش سے لے کر حالات تصنیف تک برقرار رہتا ہے، یادداشت میں پیش نہیں ہوتا یعنی یادداشت نگار اپنے گذرے ہوئے لمحات میں سے چیدہ چیدہ واقعات کو ضبط تحریر

لہ اردو میں سوانح نگاری صفحہ ۸۱

میں لانا ہے جسے نہ صرف سوانح سے قربت حاصل ہے بلکہ خود نوشت سوانح بھی اس تحریر میں اپنا اثر دکھاتی ہے۔ کوئی فرد عالم پیری میں اپنی جوانی اور جوانی سے منسلک واقعات کو یاد کر کے کچھ اہم واقعات تحریر میں لائے اور اس کا تسلسل بچپن سے نہ ہو اس کے علاوہ اس کا تعلق بڑھاپے سے بھی قائم نہ کیا جائے تو ایسی تحریر یادداشت نگاری کے صیغہ میں شمار کی جائے گی۔

اگرچہ یادداشت میں خود نوشت سوانح کا عنصر پایا جاتا ہے ممکن ہے فنی طور پر مختصر سے اختلاف کی بنا پر یادداشت کو خود نوشت سوانح سے علاحدہ طرز تحریر قرار دیا جائے، لیکن اسے ایک مکمل صنف ادب کی حیثیت نہیں دی جا سکتی۔ یادداشت نگاری کا طریقہ قدیم دور سے ہی مروج رہا۔ اس سلسلہ میں لکھا گیا ہے:

> "لیڈی فین شاہ کی لکھی ہوئی یادداشت جو ۱۶۷۲ء کی تصنیف ہے۔ ذاتی تجربے کی بہترین نمونہ ہے۔ اس میں لیڈی فین شاہ نے ہیرو بننے کی کوشش نہیں کی ہے۔" [۱]

یادداشت کے فن کی وضاحت اس حوالہ میں پوری طرح ہو جاتی ہے۔

عام طور پر خود نوشت سوانح اور سوانح حیات میں شخصیت اور اس کے کردار کو اس قدر واضح کر دیا جاتا ہے کہ اس کے مطالعہ سے صرف شخصیت نگاری کا اظہار ہو سکتا ہے لیکن یادداشت نگاری صرف شخصیت نگاری پر توجہ نہیں دیتی بلکہ شخصیت کے ان حالات کو پیش کرتی ہے جو زندگی کے کئی حصوں میں انجام پاتے ہوں اور جن کا بیان زبان اور ادب کے لیے کافی اہمیت رکھتا ہے۔ اس لحاظ سے یادداشت نگاری ایک موزوں اور معتدل طرز تحریر قرار دی جا سکتی ہے۔ جس کے ذریعہ انسان اپنی بکھری

---

[۱] نقوش آپ بیتی نمبر جون ۱۹۶۴ء صفحہ ۸۵

ہوی ناقابل فراموش یادگاروں کو مجتمع کرکے انہیں سوانحی شکل دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یادداشت نگاری عام مقبولیت حاصل نہ کرسکی کیونکہ اس فن کی تحریر کے لیے اپنی زندگی کے اہم اور ناقابل فراموش واقعات کا محاکمہ کرنا کافی دشوار ہے۔ ہر انسان اپنی زندگی کے بیشتر واقعات کو اہم سمجھتا ہے۔ اس لیے زندگی سے مربوط لاتعداد واقعات سے ناقابلِ فراموش واقعہ کو منتخب کرنا اور اس سے متعلق جزوی واقعات کو حافظہ پر زور دیتے ہوئے تحریری شکل میں پیش کرنا ایک مشکل کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادبیات میں سوانح اور خودنوشت سوانح نگار بکثرت دکھائی دیتے ہیں لیکن یادداشت نگاروں کی تعداد بہت کم ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ اپنی زندگی کے اہم واقعات میں سے دلچسپ اور پراز نصیحت کارنامے کو تلاش کرنے کی دشواری ہے۔

یادداشت نگاری درحقیقت خودنوشت سوانح کی ایک بدلی ہوئی شکل ہے جس میں سوانح کا عکس ملتا ہے لیکن اسے خودنوشت سوانح سے اس لیے مختلف تصور کیا جاتا ہے کہ خودنوشت سوانح میں زندگی کے تمام واقعات درج ہوتے ہیں جبکہ یادداشت میں زندگی کے چند اہم واقعات کو اجاگر کیا جاتا ہے۔ یادداشت اور آپ بیتی کو یکجا نہیں کیا جاسکتا کیونکہ آپ بیتی انسان پر گذرنے والے صدمات اور واقعات کا اظہار ہے اور اس کے ذریعہ زندگی کے کسی ایک پہلو جیسے قیدخانہ کی زندگی یا پھر مفلسی و بدحالی میں گذرنے والے لمحات کا ذکر ہوتا ہے۔ یعنی آپ بیتی زندگی کے کسی ایک اہم واقعہ کی خودنوشت سوانح ہے جبکہ یادداشت انسانی زندگی میں تغیر لانے والے چند واقعات کا مجموعہ اس اعتبار سے یادداشت اپنے مبدائے اصلی یعنی خودنوشت سوانح اور آپ بیتی سے مختلف ہونے کا مزاج رکھتی ہے۔

سرگذشت اور یادداشت میں بھی مختصر سا اختلاف پایا جاتا ہے۔ عام طور پر سرگذشت میں انسان اپنی زندگی کے کسمپرسی اور بدحالی کے واقعات تقدیم وتاخیر

کے ساتھ تحریر میں لاتا ہے۔ جس میں دلچسپی اور قلم کی روانی پر زور دیا جاتا ہے۔ اس طرح سرگذشت نگار کا مقصد اپنی داستانِ حیات بیان کرنے سے زیادہ قارئین کی دلچسپی برقرار رکھنا ہوتا ہے جبکہ یادداشت نگاری صرف نصیحت و عبرت کے حصول کے لیے زندگی کی کسی ایک ڈگر کی نمائندگی کرنے والے واقعات کو اکٹھا کرنے کا نام ہے اس طرح یادداشت نگاری اپنے اصولوں کے اعتبار سے سرگذشت سے بھی مختلف ہے۔ یادداشت نگاری کا رشتہ روزنامچہ اور سفرنامہ سے بھی نہیں جوڑا جاسکتا۔ اس لحاظ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ یادداشت نگاری، سوانحی مزاج رکھتے ہوئے بھی سوانح کے دیگر انداز تحریر جیسے روزنامچہ، سفرنامہ، سرگذشت، آپ بیتی، خودنوشت سوانح اور ملفوظات سے علیحدہ ایک نثری طرز تحریر ہے جس میں سوانح کا عمل اور خودنوشت سوانح کی جھلکیاں موجود ہیں۔

روزنامچہ

اردو نثر کے منفرد اسلوب میں مختلف طرز نگارشات کو شامل کیا جاتا ہے۔ ان میں "روزنامچہ" بھی اپنی اہمیت و افادیت رکھتا ہے خاص انداز منفرد لہجہ اور بیان کے ساتھ یہ اسلوب عام انسان کی زندگی کے حالات اور معاملات کو پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ روزنامچہ اپنی خصوصیت کی بنا پر کوئی علیحدہ صنف میں شمار نہیں کیا جاتا بلکہ اس کا مرتبہ ایک مرکب صنف کی حیثیت سے واضح ہوتا ہے۔ انسان کی روزمرہ مصروفیات اور مشاغل کا ذکر اس اسلوب کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ درحقیقت یہ اسلوب سوانحی بنیاد کا علمبردار ہے۔ جس کے ذریعہ انسان اپنی زندگی کے اہم واقعات اور روزانہ کے معمولات کو تاریخ میں مقید کرتے ہوئے اپنی حیات کی سوانح مرتب کرتا ہے۔ روزنامچہ ایک طرز اسلوب ہونے کے علاوہ سوانحی شکل و حیثیت بھی رکھتا ہے جس کی ابتدا اردو میں "تذکرہ نگاری" سے ہوتی ہے۔

اُردو زبان میں لفظ روزنامچہ کا استعمال فارسی کے ذریعہ ہوا۔ فارسی

زبان میں روز نامہ یا روزنامچہ ایسی کتاب یا تحریر کے لیے مستعمل ہے جس میں روز کا حال بیان کیا جائے۔ روزنامچہ کی لغوی تعریف یہ ہو سکتی ہے کہ ایسی کتاب جس میں روزانہ واقعات حالات اور روداد کا ذکر ہو اس کا شمار "روزنامچہ" میں کیا جائے گا۔ لغوی بنیادوں پہ روزنامچہ، روز کا حال لکھنے کا نمائندہ ہے روز کے حال سے مراد ان تمام ضروریات کیفیات اور حالات کا ذکر روزنامچہ میں پیوست ہو جائے گا جو انسانی زندگی میں حرکت کے ضامن ہیں۔ انسان کی سیاسی دلچسپیاں، معاشی جدوجہد، علمی و ادبی مشاغل، سماجی و فلاحی مصروفیات، رکھ رکھاؤ، شاہانہ و فقیرانہ طرز و انداز اور مذہبی و روحانی تبلیغ کا ذکر بھی ہر روز کی تاریخ میں بیان کیا جائے تو وہ "روزنامچہ" کی لغوی معنی کی نمائندگی کرے گا۔

فارسی زبان میں "روزنامچہ" کا استعمال عام طور پہ بادشاہوں کے معمولات اور ان کی روزانہ مصروفیتوں کو تحریری انداز میں رواج دینے کے لیے کیا جاتا ہے۔ یعنی اپنی دن بھر کی مصروفیات کو منصوبہ بند طور پہ مرتّب کرنے کے لیے بادشاہ یا امرا ایک مخصوص طریقہ اختیار کرتے تھے جس کی تفصیل وقت اور تاریخ کے لحاظ سے تحریری طور پہ محفوظ کر دی جاتی تھی اور یہی عمل ہر روز کی مصروفیات کا نمائندہ ہوتا ہے چونکہ ایسی تحریروں میں روزانہ کی مصروفیات کا ذکر ہوتا۔ اس لیے انھیں "روزنامچہ" کا عنوان دے دیا گیا۔ ایرانی اور ہندوستانی بادشاہوں کے درباروں میں روزنامچہ نگار موجود ہوتے جو بادشاہ کی مصروفیات کی تفصیل ہر روز کے بیان میں قلمبند کرتے تھے۔ یہی طریقے آج کے ادیب اپناتے ہیں اور انہیں ادبیات میں "روزنامچہ نگاری" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

لفظ "روزنامچہ" فارسی ترکیب سے اردو میں مروج ہوا۔ فارسی زبان میں "روزنامہ" لفظ اس کی ابتدائی ہیئت "روز" سے اختیار کیا گیا ہے۔ فارسی میں "روز" کا لفظ "دن" کے لیے مستعمل ہے اور اسی روز سے ایک نئی ترکیب "روزنامچہ" اختیار

کی گئی۔ "روزنامچہ" کا لفظ دو الفاظ سے مرکب ہے جس کے مطابق روز یعنی دن نامچہ بمعنی "لکھا ہوا" کے لیے گئے ہیں۔ اس طرح "روزنامچہ" سے مراد ایسی تحریر ہوگی جو دن بھر کی مصروفیات کو ایک ہی دن میں تحریری طور پر پیش کیا کرے یعنی آج کی مصروفیات کو آج کی تاریخ میں ہی لکھنا "روزنامچہ" کہلائے گا۔ یہ ممکن ہے کہ طوالت یا مصروفیات کی بنا پر آج کے مشاغل دوسرے دن تحریر کیے جائیں لیکن روزنامچہ کے ذریعہ صرف ایسی تحریریں ادبی اسلوب میں شمار کی جائیں گی جو روز کی کیفیات کی نشاندہی کرتی ہوں۔ فارسی زبان کے دو الفاظ کے اشتراک سے بننے والا لفظ "روزنامچہ" فنی طور پر ایک منفرد اسلوبِ نثر کی حیثیت سے فارسی اور اردو زبان میں مروّج ہوا۔

انگریزی زبان میں روزنامچہ کے لیے DIARY کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ لفظ ڈائری اپنی بنیاد کے اعتبار سے لاطینی زبان کے DIARIUM سے استفادہ کرتا ہے۔ لاطینی زبان میں DIARIUM کے معنی DAY یا دن کے ہوتے ہیں۔ DIARIUM کا لفظ تصرف میں لایا جا کر DIES میں تبدیل ہوا اور پھر وہ اپنی ہیئت بدلتے ہوئے DAY کی حیثیت اختیار کر گیا۔ لفظ DAY سے انگریزی میں ڈائری DIARY کا رواج ہوا جو درحقیقت لاطینی لفظ DIARIUM کا مترادف ہے۔ اس اعتبار سے انگریزی زبان میں DIARY کا لفظ روزنامچہ کے لیے موزوں "درمتبادل" قرار دیا جا سکتا ہے۔ فنی طور پر ڈائری کے اسلوب اور اس کے انداز و تشکیل کی تعریف کرتے ہوئے انسائیکلوپیڈیا کے مرتبین نے روزنامچہ کے بارے میں لکھا ہے۔

"A Daily record of eventskept by a diarist It describes matters coming under the writer's observation, including those gleaved from

contemporary reports correspondence and conversation with his personal comments. Not all daily record kept by an individual are diaries in the generally accepted sense of terms connoting those which have biographical, historical or literary value. the word journal is often used synonymously. The Sir walter Scotts Journals is diary. The ancient Greeks kept diaries (ephemerides)

"روزنامچہ نویسی" کی نئی تعریف کرتے ہوئے اس بیان میں انسائیکلوپیڈیا کے مرتبین نے بتایا ہے کہ روزنامچہ سے مراد ایسے اندرجات ہیں جن میں روزانہ معاملات کا ذکر کیا جائے۔ اس کے علاوہ اس کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ روزنامچہ نویس اپنی تحریر سے اندراجات کرتے ہوئے روزانہ تحریر کرنے کے فن کو ظاہر کرتا ہے یعنی روزنامچہ ایسی تحریری خصوصیت قرار پائے گی جس میں بذات خود اپنے حالات اور تجربات ہر روز کی روشنی میں قلمبند کیے جائیں۔ درحقیقت روزنامچہ نویسی ذاتی مشاہدات کی آئینہ دار ہے جس کے ذریعہ مصنف اپنے روزانہ کے حالات لکھتا اور بیانیہ انداز کے ذریعہ روز کے معاملات کی روشنی میں خود کی زندگی کا عکس پیش کرتا ہے۔

روزنامچہ کی تشریح کرتے ہوئے اس بیان میں بتایا گیا ہے کہ یہ ایسا طرز اسلوب ہے جس کے ذریعہ دستاویزی خصوصیت تکمیل پاتی ہے۔ یعنی روزنامچہ نویس کی

Encyclopedia Americana , Vol I X PP 72 ۱ۓ

تحریروں سے مخصوص دور کے حالات کے پس منظر میں زندگی رواں دواں دیکھی جاسکتی ہے۔ ڈائری درحقیقت چند اندراجات، خانگی معاملات، انفرادی خصوصیات اور باہمی گفتگو کے علاوہ خط وکتابت اور مراسلت سے مربوط ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا شمار شخصی حالات و معاملات کی عکاسی کی وجہ سے سوانح عمری میں کیا جاتا ہے بلکہ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ روزنامچہ شخصی سوانح عمری کی حیثیت رکھتا ہے۔

روزنامچہ کو اُردو کی قدیم طرز تحریر "تذکرہ" سے اس لیے مربوط کیا جاتا ہے کہ اردو زبان میں جدید صنف سوانح نگاری کی تشکیل تذکرہ گوئی سے ہوئی۔ اس کے علاوہ روزنامچہ ایک انسان کی شخصیت کا تذکرہ کیا جاسکتا ہے۔ جس میں خودنوشت سوانح کی خصوصیت اور فن سوانح نگاری کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ روزنامچہ نویسی اردو تذکرہ نگاری سے قریب، سوانح نگاری سے ازلی رشتہ اور خودنوشت سوانح سے پوری طرح استفادہ کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ مجموعی اعتبار سے روزنامچہ، سوانح، تذکرہ اور خودنوشت سے قریبی تعلق رکھتا ہے۔

روزنامچہ نویسی کے دوران سیاسی، سماجی اور ادبی اقدار کی پیشکش ممکن ہے۔ اس کے علاوہ تاریخی اور معاشرتی معاملات کی جھلکیاں بھی مبسوط حیثیت میں روزنامچہ کے ذریعہ اکٹھا کی جاتی ہیں۔ شخصی واردات اور منفرد ذہنیت کی عکاسی بھی روزنامچہ کے ذریعہ ممکن ہے۔ ایک اعتبار سے روزنامچہ سوانحی، تاریخی اور ادبی اقدار کا حامل ہوتا ہے جس میں شعوری طور پر ذاتی حالات قلمبند کرنے کا طریقہ اپنایا جاتا ہے۔ اگرچہ روزنامچہ نویسی ایک مکمل صنف کی حیثیت نہیں رکھتی لیکن اس طرز کے ذریعہ شخصی انفرادیت اور ذاتی صلاحیت کے علاوہ اہم خدمات اور خصوصیات کا ذکر روزانہ کی تاریخ کے پس منظر میں کیا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ دور میں روزنامچہ نویسی کو بنیاد بنا کر خودنوشت سوانح عمریاں لکھی جارہی ہیں۔

روزنامچہ نویسی کے ذریعہ شخصیت اور کارناموں کی تحقیق اور مواد کی فراہمی کا عمل تکمیل پاسکتا ہے۔ زندگی کے حقائق، اصلیت کے روپ میں نمایاں ہوسکتے ہیں یعنی اگر کوئی محقق کسی شخصیت کی سوانح اور خدمات کی پیش کشی کا ارادہ رکھتا ہو تو اس کے لیے موضوع اور مواد کی فراہمی میں روزنامچہ کا اسلوب اپنا حق ادا کرسکتا ہے۔ ان بنیادی خصوصیات کی وجہ سے روزنامچہ کو ایک اسلوب کے درجہ کے علاوہ شخصیت اور کارناموں کی تحقیقی تشکیل میں معاون بننے والی بہترین طرزِ اظہار کی حیثیت دی جاتی ہے۔ روزنامچہ، اردو نثر کی ایک قیمتی طرزِ تحریر ہے جس سے تشکیل انسانیت کے علاوہ خدمات اور ان کا عکس واضح ہوتا ہے۔ چنانچہ روزنامچہ کے فن کے بارے میں یہ کہا گیا ہے۔

"ڈائری یا روزنامچہ ادب کا ایک شعبہ ہے بعض روزنامچے عالمگیر شہرت کے مالک ہیں۔ اٹلی اور انگلستان میں بعض نامور ادیبوں نے اپنے روزنامچے لکھے۔ ان روزنامچوں سے نہ صرف لکھنے والے کے سوانح معلوم ہوتے ہیں بلکہ اس کے دور پر روشنی پڑتی ہے۔ ہم ایک پورے دور کو ایک شخصیت کے روزنامچہ میں جلوہ گر دیکھتے ہیں۔ ہمارے زمانے میں خواجہ حسن نظامی کے روزنامچے بڑے مقبول ہوئے۔ یہ روزنامچے اولاً رسالہ "درویش" دہلی اور اس کے بعد رسالہ "منادی" دہلی میں شائع ہوتے رہے۔ یہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ جو روزنامچے اشاعت کی غرض سے تحریر میں لائے جاتے ہیں ان میں ایک پہلو نمائش کا ہوسکتا ہے۔ اور دوسرا افشائے حقیقت کا۔ یعنی لکھنے والا جس رنگ میں اپنے کو پیش کرنا چاہے۔ روزنامچہ کی بہترین صورت وہ ہے۔ جب لکھنے والا اپنی یادداشت سے یا روزنامچہ لکھے نہ کہ اشاعت

کی غرض سے۔ خود نوشت سوانح نگاری میں روزنامچہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے اس لیے کہ روزنامچہ میں مصنف کے شب و روز کا ذکر خود اس کے قلم سے ہوتا ہے۔ روزنامچہ کی ایک خالص ادبی صورت بھی ہے۔[1]

شخصیت اور شخصیت کا تعلق عہد سے اور پھر زندگی پر مرتب ہونے والے اثرات کا جائزہ روزنامچہ کے ذریعہ تکمیل پاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روزنامچہ جزئیات اور پرکاری میں بعض اوقات خود نوشت سوانح سے بھی بازی لے جاتا ہے۔ انسان کے روزانہ حرکات اور مشاہدات کا ذکر صرف روزنامچہ کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔ اور اسی فن کو بنیاد بنا کر سوانح ترتیب دی جا سکتی ہے۔ درحقیقت روزنامچہ ایک ایسی طرز تحریر ہے جس میں جذبات، تاثرات اور مشاہدات کے علاوہ عام حالات کے تغیر کا جائزہ بھی ممکن ہے۔ اس لیے روزنامچہ ذاتی تجربات، شخصی کارنامے اور سیاسی، معاشی، اقتصادی تبدیلیوں کا ایک ایسا اظہار ہے جس کے ذریعہ انسان کی شخصیت کے مختلف دنیاوی معاملات سے دلچسپی کا پتہ چلتا ہے۔ ڈاکٹر سید شاہ علی روزنامچہ کی خصوصیت کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"روزنامچہ نگاری میں بھی اسی قدر تنوع پایا جاتا ہے جس قدر کہ فطرت انسانی میں کسی ناول یا افسانے کے انجام کی طرح اس کی دلچسپی بھی سب سے زیادہ مستقبل سے ناآگہی میں مضمر ہوتی ہے جو مصنف کے ذہنی عمل اور ردعمل کو ظاہر کرتی ہے۔ اسی لیے روزنامچہ نگاری کے لیے کسی نمونہ کی ضرورت ہوتی ہے نہ ادبیت کے اظہار کی لیکن ایک چیز جس پر زور دینا ضروری ہے وہ ایجاز و اختصار ہے۔ طوالت، لکھنے والوں اور پڑھنے والوں دونوں کے لیے

---

[1] نقوش۔ آپ بیتی نمبر۔ جون ۱۹۶۴ء صہ ۲۳

دردِ سر کا باعث بن جاتی ہے اور اظہارِ مطلب کے لیے بھی طوالت غیر ضروری بلکہ مضر ہے۔" ؎ ۱

روزنامچہ کی تحریر کے لیے اختصار کو ضرورت قرار دیتے ہوئے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ روزنامچہ نویسی ایک بہترین طرزِ تحریر ہے۔ لیکن اس فن کو طوالت کی وجہ سے نقصان پہنچتا ہے۔ اگر روزنامچہ مختصر اور جامع ہو تو اس کی ادبی حیثیت دو بالا ہو جائے گی۔ روزنامچہ نگار کو ناول اور افسانہ نگار کی طرح اپنی روزانہ مصروفیات کو ادبی انداز کے علاوہ تجسّس آمیز اسلوب سے نوازنا پڑتا ہے تاکہ پڑھنے والوں کی دلچسپی آغاز سے اختتام تک برقرار رہے۔ ایک بہترین روزنامچہ کی یہی خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ مختصر وقت میں پڑھا جاسکے اور ساتھ ہی ادبی طور پر اس میں محویت کو اس طرح مدغم کیا جائے کہ جس کے بعد روزنامچہ، افسانوی خصوصیت اور ناولانہ صلاحیت کا علمبردار ہو جائے۔

روزنامچہ نگاری میں ذاتی تاثرات کو زبان و بیان کی چاشنی سے مربوط کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روزنامچہ اسی وقت کامیابی کے زینے طے کرسکتا ہے جبکہ اس کے تحریر کرنے کا انداز منفرد حیثیت کا حامل ہو اور اس کی تحریر میں لچک اور جاذبیت ہو۔ عام طور پر مبہم اسلوب اور غیر معیاری طرز و انداز سے فن کو اجاگر کرنے والا مصنف روزنامچہ کے ذریعہ منظرِ عام پر نہیں آسکتا۔ کیونکہ اس کی تحریر جاذبِ نظر نہیں ہوتی۔ روزنامچہ کے لیے تحریر کی دلکشی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اسی روزنامچہ کے ذریعہ نہ صرف ایک فرد اپنی زندگی کے واقعات قلمبند کرتا ہے بلکہ اپنے معاصرین سے تعلقات کا بھی ذکر کرتا ہے۔ جس کی وجہ سے روزنامچہ نگاری میں ایک عہد کے واقعات و حالات کی تاریخ کو شخصیت کے پس منظر میں یکجا کیا جاسکتا ہے اور اس خصوصیت کی بنا پر روزنامچہ ایک انفرادی طرزِ تحریر کا غماز ہو جاتا ہے۔

سفرنامہ

انسان کی زندگی کئی حالات اور واقعات سے مربوط ہوتی ہے۔ زندگی کو گذارنے کے لیے وہ مختلف نشیب و فراز سے گذرتا اور خوش حالی و بدحالی کا سامنا کرتا ہوا اس دنیا میں اپنی بود و باش کو آگے بڑھاتا ہے۔ زندگی کا ایک عجیب و غریب لمحہ نقل مقام کرنے سے معنون ہے یعنی ہر انسان کو زندگی کے کسی حصے میں بھی ایک مقام سے دوسرے مقام تک سفر کرنے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ اسی دوران سفر کے حالات کو تحریری شکل دے کر نثر میں پیش کرنا "سفرنامہ" کہلاتا ہے۔ یعنی انسانی زندگی کے وہ حالات جو سفر میں بیت جائیں ان کا تذکرہ کرنا "سفرنامہ" کی تعریف میں شامل ہے۔ "سفرنامہ کا ربط فنی طور پر تذکرہ سے قریب اور سوانح سے بالکلیہ منسلک ہے۔ اسی لیے سفرنامہ کو تذکرہ نگاری کی ایک شکل سمجھا جاتا ہے۔

اردو کے نثری اسلوب میں "سفرنامہ" ایک خاص انداز اور طرز نگارش کا نمائندہ ہے۔ اس فن کے ذریعہ انسان اپنے حالات سفر بیان کرتا اور مشکلات و مصائب کا ذکر کرتے ہوئے اپنی زندگی کے حالات قلمبند کرتا ہے۔ اس اعتبار سے سفرنامہ فنی طور پر "خود نوشت سوانح" سے قریبی تعلق رکھتا ہے۔ سفرنامہ کوئی علیحدہ صنف نثر نہیں بلکہ یہ مرکب طرز تحریر کا درجہ رکھتا ہے۔ جس کے ذریعہ انسان کے حالات سفر سے واقفیت ہوتی ہے۔ فنی طور پر سفرنامہ ایک طرز نگارش کے علاوہ کوئی اور ادبی حیثیت نہیں رکھتا اگرچہ ادبی طور پر سفرنامہ تحریر کرنے کا رواج قدیم زمانے سے رہا لیکن اسے مکمل صنف ادب کی حیثیت نہیں دی گئی۔ کیونکہ یہ زندگی کے کسی ایک پہلو کی نمائندگی کرتا ہے۔

"سفرنامہ" کا لفظ عربی سے اردو میں مروج ہوا جو دو الفاظ سے مرکب ہونے کی دلیل پیش کرتا ہے۔ عربی زبان میں سفر کا لفظ مسافرت یا وطن سے باہر جانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔[1] اور عربی لفظ نامہ کے معنی لکھا ہوا خط یا چھٹی کے ہوتے ہیں۔[2] اس ترکیب سے سفرنامہ کی حیثیت لکھی ہوئی مسافرت یا سفر کے دوران لکھا ہوا کارنامہ قرار دیا جائے گا۔ معنوی اعتبار سے سفرنامہ سے مراد ایسی طرز تحریر لی جائے گی جس میں کوئی انسان وطن سے باہر سفر کر کے اس سفر کے حالات تحریری طور پر قلمبند کرے۔ اس اعتبار

---

[1] نقوش۔ آپ بیتی نمبر جون ۱۹۶۴ء صفحہ ۴۷ - ۴۹

ہے سفرنامہ ایک ایسا طرز اسلوب قرار پاتا ہے جس کے ذریعہ حالات سفر کو طرز نگارش کی زینت دینے کا مفہوم ادا ہوتا ہے۔ اس طرز تحریر کے ذریعہ سفر کے دوران پیش آنے والے حیرت انگیز اور عجیب و غریب حالات کا تذکرہ بھی ہوتا ہے۔ اسی لیے یہ طرز تحریر فنی طور پر دلچسپ اور محویت کو برقرار رکھنے والی سمجھی جاتی ہے۔

اردو نثر میں سفرنامہ کا فن قدیم دور ہی سے رائج رہا۔ بسا اوقات سفرنامہ داستانوی انداز پر بھی لکھے گئے۔ ان داستانوی سفرناموں میں حیرت واستعجاب اور دلچسپی کے تمام سامان میسر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سفرنامے ہر ادب میں اپنی حیثیت اور مقبولیت رکھتے ہیں۔ اردو میں "سندھ باد جہازی" کا سفرنامہ داستانوی عناصر کو پیش کرنے کے باوجود بھی اپنی مقبولیت کو دوبالا کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ سفرنامہ کا انداز تفریحی اور حصول معلومات کی وجہ سے بھی اہمیت رکھتا ہے۔ ایک مقام سے دوسرے مقام تک، ایک ملک سے دوسرے ملک تک اور ایک تاریخی شہر سے دوسرے شہر تک سفر کرنا اور ان مقامات کے حالات قلمبند کرنا قارئین کے لیے معلومات میں اضافہ کا سبب بنتا ہے۔ اسی لیے سفرنامہ ثقافتی تعلقات ہموار کرنے کا ذریعہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ جس سے نہ صرف تلاش وجستجو کا اظہار ہوتا ہے بلکہ نئی دنیا کی دریافت اور سفر کے دوران انسانی تجربات کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ دنیا کے ادبیات میں سفرنامے تجسس ذہنیت کے علمبردار ہیں۔ ایک انسان کا اپنے وطن سے نکل کر جنگلوں میں مارے مارے پھرنا دریاؤں اور سمندروں میں طوفان کے مقابلے کرنا، طرح طرح کے مصائب سے دوچار ہونا یہ ثابت کرتا ہے کہ ایک انسان میں یہ.... خواہش ہوتی ہے کہ وہ سفر کرے اور نئی نئی جگہیں دریافت کرے۔ سفرناموں کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھا جاتا ہے:

"ہر زبان کے ادب میں سفرناموں کی بہتات ہے ان سفرناموں میں بعض اوقات بے سروپا باتیں بھی ہوتی ہیں۔ سفر کرنے والے یہ سمجھتے ہیں کہ

جو کچھ ہم بیان کریں گے اس پر پڑھنے والے پورا یقین کرلیں گے۔ چنانچہ وہ جھوٹ اور سچ کو خلط ملط کرتے آئے ہیں۔ بہر حال مبالغہ آرائی سے قطع نظر بھی سفر ناموں میں بہت ہوتا ہے۔ ان میں دوسروں کے حالات بھی ہوتے ہیں۔ اور اپنے تجربات بھی۔ ان میں مشہور مقامات اور مشہور شخصیات کی تصویر کشی بھی ہوتی ہے۔ اس طرح جگ بیتی کا سنگم اگر ملتا ہے تو سفر ناموں میں.....
ان سفر ناموں کے پڑھنے سے ہماری فطرت کا ایک بنیادی تقاضہ تسکین پاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ سفر نامے اس قدر مقبول ہیں۔ اردو زبان میں بھی سفر ناموں کی کوئی کمی نہیں۔ علامہ شبلی اور خواجہ حسن نظامی نے بلاد اسلامیہ میں اپنے سفر کا حال ایسے منفرد انداز میں لکھا ہے کہ ان کے سفر نامے ہمارے ادب کا جزبن کر رہ گئے ہیں"۔[1]

سفر نامے کے فن کی وضاحت کرتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ درحقیقت سفر نامہ ایک ایسا طرز تحریر ہے جس کے ذریعہ انسان اپنے تجربات بیان کرتے ہوئے مشہور مقامات اور مشہور شخصیتوں کے ذکر کے علاوہ سفر کے دوران پیش آنے والے واقعات کو بھی اپنی طرز تحریر کا ذریعہ بناتا ہے۔ یعنی سفر نامہ سفر کے دوران پیش آنے والے حادثات کے علاوہ تاریخی مقامات اور دستاویزی حیثیت کی چیزوں کا تذکرہ ہے جس سے سفر نامہ لکھنے والا متاثر ہونے کے بعد انہیں تحریری شکل دیتا ہے۔ سفر نامے میں صرف سفر کا حال نہیں لکھا جاتا بلکہ مصیبتوں کے ناگہانی آجانے اور ان کی روک تھام کے لیے انسانی تدبیر کا ذکر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سفر نامے میں ہیبت، سراسیمگی اور انوکھا پن محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ سفر نامے میں بعض اوقات ناممکنات کا اظہار بھی ہوتا ہے یعنی

---

[1] نقوش۔ آپ بیتی نمبر جون ۱۹۶۴ء ص۷

سفرنامے اس قدر حیرت ناک ہوتے ہیں کہ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے سفرنامہ امیدوں کے سہارے آگے بڑھ رہا ہے۔ سفرنامے کی یہ ایک خصوصیت ہے کہ اسی کے ذریعہ انسان کی زندگی میں پیش آنے والے عجیب و غریب واقعات کا ذکر کیا جاتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ سفرنامے میں غلط بیانی سے کام لیا جائے لیکن اس مبالغہ آرائی کی بنا پر ہر سفرنامے کو جھوٹ کا پلندہ ہونے کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ کیونکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا میں انسان کی زندگی ایک سفر کی طرح گذر رہی ہے۔ اسی لیے سفرِ حیات کو گذارنے کے لیے اسے طرح طرح کے طریقے اپنانے پڑتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح جب انسان ایک ملک سے دوسرے ملک تک سفر کی راہ اختیار کرتا ہے تو اسے اس سفر میں نہ صرف مصیبتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں بلکہ حالت سفر میں پیش آنے والی مشکلات کا بہادری سے مقابلہ بھی کرنا پڑتا ہے۔ اس اعتبار سے سفرنامہ مصیبتوں کے بیان اور حالت سفر میں مشکلات کا سامنا کرنے کا ایک ایسا اظہار ہے کہ جس کے ذریعہ سفر کے دوران مشاہدات میں آنے والی تمام اشیاء کا ذکر کیا جاتا ہے۔

ملفوظات

بزرگوں کے اقوال اور ان کے کلام کو محفوظ کرنے کا طریقہ قدیم زمانے سے رائج ہے۔ ہر دور میں بزرگان دین اور عقیدت مندوں کی کمی نہیں رہی۔ خدا کے نیک اور بزرگ بندے حالت وجد یا مراقبہ کی حالت میں جو الفاظ کہہ دیتے ہیں انہیں عقیدت مند لکھ کر محفوظ کر لیتے تھے۔ یہ طریقہ قدیم زمانے سے رائج رہا اور اس قسم کی تحریروں کو اردو زبان میں ملفوظات کا نام دیا جاتا ہے۔ اُردو نثر کی یہ ایک ایسی تحریری خصوصیت ہے جس میں اولیائے کرام کے فقرے اور جملے اکٹھا کر کے محفوظ حالت میں رکھے جاتے ہیں اور جس کی عظمت کے سامنے ہمارے سر احترام سے جھک جاتے ہیں

ملفوظ کا لفظ عربی زبان سے اُردو میں مروج ہوا جو صیغۂ واحد میں مستعمل ہے۔ اس لفظ کی جمع ملفوظات کے لفظ سے کی جاتی ہے جس کے معنی ایسی کتاب جس میں

بزرگوں کی کیفیت لکھی گئی ہو ان کے ہوتے ہیں۔ عام طور پر ملفوظات کا لفظ بزرگوں کا کلام[۱] حدیث بزرگان اور اولیاء اللہ کا کلام کے مفہوم کو ادا کرنے کے لیے مستعمل ہے۔ لغوی اعتبار سے ملفوظات ایسی تحریروں کو کہا جائے گا جس میں بزرگ ترین انسانوں کے فقرے اور جملے تحریری طور پر قلمبند کیے گئے ہوں۔ یعنی خدا کے وہ بزرگ ترین بندے جو عبادت و ریاضت کو اپنا شیوہ بنائے ہوئے ہر وقت خدا کی یاد میں مصروف رہتے ہوں اور ان کی زبان سے کسی خاص موقع پر زندگی اور زندگی کی حیثیت کے بارے میں فقرات ادا ہوں تو ان کے عقیدت مندوں نے انہیں جوں کا توں تحریری شکل دے دی۔ اس انداز کو اردو میں ملفوظات نگاری کہا جاتا ہے۔

فنی اعتبار سے ملفوظات ایسے فقروں کو کہا جاتا ہے جو نہ صرف زندگی کے واقعات کو احاطہ کیے ہوئے ہوتے ہیں بلکہ اس دور کی زبان و بیان کو بھی پیش کرتے ہیں۔ اردو کے ابتدائی مخطوطات کے مطالعہ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اولیا اور صوفیا نے اپنے بیانیہ جملوں سے نہ صرف خدا پرستی اختیار کی بلکہ انسانوں کے دلوں پر بھی حکمرانی کی، اردو میں ابتدائی طور پر ملفوظات کی طویل فہرست ملتی ہے اور یہ سلسلہ ۱۴۰۰ء سے ۱۶۰۰ء تک قائم رہتا ہے۔ سید برہان الدین عالم شاہ، سید محمد راجو قتال، نظام الدین اولیاء، سلطان قطب الدین اور سلطان سکندر کی تحریروں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اردو ادب میں ابتدائی طور پر ملفوظات کا سلسلہ جاری رہا۔ جو رفتہ رفتہ ترقی کرتے ہوئے کتبہ کی شکل اختیار کرتا گیا۔ اردو ملفوظات کی زبان پر پنجابی، سرائیکی، گجراتی برج بھاشا اور کھڑی بولی کے اثرات بہت واضح ہیں۔[۳]

۱۔ فرہنگ آصفیہ۔ جلد چہارم ص ۴۰۳

۲۔ تاریخ ادب اردو جلد اول ص ۹۵

۳۔ تاریخ ادب اردو جلد اول ص ۹۹

اردو نثر کی ابتداء میں بزرگان دین کے ملفوظات کے علاوہ کوئی اور واضح ثبوت نہیں ملتا کہ جس سے یہ ثابت ہوسکے کہ اس دور میں اردو ترقی پا رہی تھی یعنی قدیم دور کے ملفوظات ہی سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ زبان کی ترقی کے لیے سازگار ماحول پیدا ہو گیا تھا۔ اردو ملفوظات کی تفصیل کے بارے میں ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں۔

"جب ہم شاہ وجیہہ الدین علوی گجراتی ۱۵۰۴ء تا ۱۵۸۹ء کے ملفوظات فقروں اور فارسی عبارت میں استعمال کیے جانے والے اردو زبان کے الفاظ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان کی زبان زیادہ صاف نظر آتی ہے ..... درس و تدریس ان کا پیشہ تھا اور ان کے شاگرد و مرید سارے گجرات میں پھیلے ہوئے تھے۔ ان کے مریدوں نے "بحر الحقائق" کے نام سے ایک مجموعہ مرتب کیا تھا جس میں سوال فارسی میں اور ان کے جواب جو شاہ وجیہہ الدین نے دیئے ہیں اردو میں ہیں۔" [1]

اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ پندرھویں صدی عیسوی تک ملفوظات کا سلسلہ جاری رہا۔ اردو زبان کی ابتداء میں فارسی تحریروں کے درمیان اردو کے چیدہ چیدہ جملے اور فقرے چست کیے ہوئے نظر آتے ہیں جنھیں ملفوظات کا درجہ حاصل ہے۔ عام طور پر ملفوظات سے مراد ایسے فقرے اور جملے لیے جائیں گے جو اردو کے ابتداء کے وقت فارسی تصانیف اور تحریروں میں بیان کیے گئے اردو الفاظ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے ملفوظات ایسی تحریریں قرار پاتی ہیں جن میں ایک نئی زبان کا عکس پایا جائے۔ اگر فارسی کتاب میں جو قدیم ہو اردو کے جملے مستعمل ہوں

---

[1] تاریخ ادب اردو حصہ اول۔ از ڈاکٹر جمیل جالبی۔ صفحہ ۱۰۰

اور ان کی حیثیت علمی و ادبی اعتبار سے معیاری ہو تو انہیں ملفوظات کا درجہ حاصل ہو جائے گا۔

فنیّ اعتبار سے ملفوظات مذہبی تحریروں میں فقرے چست کرنے اور بزرگان دین کے اقوال زرین اکٹھا کرنے کے مفہوم سے وابستہ ہیں یہ ملفوظات بیان کرنے والا انہیں ترتیب نہیں دیتا بلکہ اس کے لواحقین اور اس سے وابستگی رکھنے والے اسے ترتیب دیتے ہیں۔ اس فنیّ تعریف کے پس منظر میں ملفوظات ایسی تحریریں قرار پاتی ہیں جو کسی بزرگ کی زبان سے ادا ہوتی ہیں اور عقیدت مندوں کے قلم سے تحریری شکل پاتی ہیں۔ درحقیقت ملفوظات نگاری ایک تحریری شکل ہے جو خاص انداز اور خدا پرستی کے جذبہ سے وابستہ ہوتی ہے جن کے ذریعہ انسان اپنی اصلاح کر سکتا ہے۔

ملفوظات نگاری کو ادب میں طرز تحریر کی شکل حاصل ہے۔ اسے صنف ادب کا مقام نہیں دیا جا سکتا اور نہ ہی اس میں ادبی ضروریات کی پوری طرح نمائندگی ہوتی ہے کیونکہ ان کی حیثیت جملوں اور فقروں کی شکل میں چیدہ چیدہ کتابوں میں بکھری ہوتی ہے۔ اسی لیے ان کا ادبی مرتبہ متعین کرنا قطعی ناممکن ہے۔ البتہ یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ ملفوظات خالص اخلاقی اور مذہبی اصولوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ملفوظات کے ذریعہ خدا سے محبت کے جذبہ کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ یہ طرز تحریر صرف جملوں کی حد تک محدود ہوتی ہے جس سے یہ پتہ لگایا جا سکتا ہے کہ قدیم دور میں زبان و بیان کی تراش و خراش کس نہج پر تھی۔ اسی وجہ سے ادب میں ملفوظات کو اہمیت دی جاتی ہے۔ ترقی یافتہ قوموں میں ملفوظات قوموں کے مزاج اور ان کے آباد اجداد کے رہن سہن کے علاوہ ان کے اصول زندگی کو پہچاننے میں فیصلہ کا حق رکھتے ہیں۔ اردو ادب میں ملفوظات کے مطالعہ سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس زبان

کی ابتداء میں صوفیا اور علماء نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ تحقیق کے میدان میں جہاں حوالہ جات اور تحقیقی نوادرات کی پہنچ نہیں ہوسکتی۔ اس مرحلے پر تحقیق کے لیے ملفوظات بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ محققین کے نزدیک ملفوظات کو خاص اہمیت دی جاتی ہے۔

اُردو میں ملفوظات نگاری کا عہد نویں صدی ہجری سے دسویں صدی ہجری تک جاری رہا[1] جس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اُردو زبان اپنی نودمیدہ زمانے میں علماء، صوفیا اور اولیاء کرام کے دامن میں پلتی رہی اور ان ملفوظات کی وجہ سے اردو زبان کی تاریخ پر روشنی پڑتی ہے۔ جس سے تحقیق کے لیے اُردو زبان وادب کے آغاز وابتداء کے بارے میں قیمتی مواد دستیاب ہوتا ہے۔

ملفوظات درحقیقت پیرِ طریقت کی زندگی کا جزو ہوتے ہیں جن کی تاریخی حیثیت اور ان کے وجود کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے علم الدین سالک نے اپنے مضمون "آپ بیتیوں کے بعض نمایاں پہلو" میں تحریر کیا ہے۔

"صوفیاء جب ہندوستان آئے تو وہ اپنے ساتھ اسلام کی سادگی اخوت اور مساوات بھی لائے وہ جہاں بھی گئے ان کی صحبت میں ہندو مسلمان اور اچھوت برابر حاضر ہوتے رہتے ان میں سے اکثر کے اخلاق وکردار سے متاثر ہوکر ہندوؤں نے اسلام قبول کیا۔ دن میں ایک وقت ایسا آتا جب ایک عام مجلس منعقد ہوتی جس میں ہر شخص مذہب وملّت کے اختلاف کے باوجود شریک ہوسکتا تھا۔ یہاں زندگی کے اکثر پہلوؤں پر گفتگو ہوتی۔ کبھی کبھی حالات اور معاشرہ بھی زیرِ بحث آجاتا۔ پیرِ طریقت ان موضوعات پر بڑی بے تکلّفی سے گفتگو کرتا اس کے بعض مرید جو تقرّب کا درجہ رکھتے اشارات لکھتے جاتے

گھر جا کر انہیں مرتب کرتے اور پھر جب جماعت خانے (خانقاہ) میں اپنے مرشد کے حضور میں باریابی حاصل کرتے تو اپنے لکھے ہوئے ملفوظات اپنے مرشد کو سناتے۔ اگر وہ کہہ دیتا کہ تم نے میرے مفہوم کو صحیح صحیح بیان کر دیا ہے تو اس کے دوسرے مرید اس کی نقول حاصل کر لیتے اس طرح یہ حلقۂ خاص سے نکل کر عوام تک پہنچ جاتے ...... ملفوظات میں جہاں ایک صاحب سجّادہ کے روزمرہ کے مشاغل کا ذکر ملتا ہے وہاں اس وقت کی سیاست، معاشرت اور لوگوں کی اقتصادی حالت کا علم بھی ہو جاتا ہے اس زمانہ کی تعلیم و تربیت کے بارے میں سب سے زیادہ بیش بہا معلومات ہمیں فقط انہی سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ ان کو پڑھنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بڑے بڑے فاتح کشور کشا اور شہنشاہ بھی اکثر مشکلات اور پریشانیوں کے وقت انہی بوریا نشینوں کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔"[1]

ملفوظات کوئی منظم اور اصولی طور پر سوانحی خصوصیات نہیں رکھتے۔ لیکن انہیں بھی تذکرے کی ایک قسم اور سوانح کی ترتیب میں اہم مواد تصور کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے نہ صرف قدیم تاریخ کا پتہ چلتا ہے بلکہ قدیم مجلسوں کی تاریخ بھی ملفوظات سے مدوّن کی جا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملفوظات کسی بھی ادب کے آغاز اور قوم کے ابتدائی اصول کی نمائندگی کرنے میں پوری طرح کامیاب ہیں جس طرح ایک تذکرہ میں کسی شخصیت کے مشاغل اور اس کی زندگی کے علاوہ کارناموں کا ذکر کیا جاتا اسی طرح ملفوظات میں پیرِ طریقت کی زندگی کے چند اہم واقعات اور مریدین سے ان کے تعلقات

---

[1] نقوش آپ بیتی نمبر جون ۱۹۶۴ء از طفیل احمد۔ صفحہ ۵۰ و ۵۱

تبلیغی طریقوں اور اسلامی زندگی کو بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے اس اعتبار سے ملفوظات تاریخی نوادرات کی حیثیت رکھنے کے باوجود بھی ادبی طور پر تذکرہ سے رشتہ جوڑتے ہوتے ہیں جس میں سوانحی انداز کا جز مختصر طور پر پایا جاتا ہے۔

تذکرے کے انداز اور نقوش ملفوظات میں ذیلی طور پر موجود ہوتے ہیں بالفاظ دیگر ملفوظات پیر طریقت کا مختصر تجرباتی تذکرہ ہوتا ہے جس میں پیر طریقت کی زندگی سے زیادہ عام لوگوں سے اس کے روابط سے بحث کی جاتی ہے یعنی ملفوظات درحقیقت آپسی تعلقات کو اجاگر کرنے والا ایک تذکرہ ہے۔ اس خصوص میں محمد اجمل خاں "ملفوظات آزاد" کے مقدمہ میں رقمطراز ہیں۔

"ملفوظات سے نہ صرف اس تاریخی دور کی سماجی و سیاسی تاریخ مرتب ہوسکتی ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہوسکتا ہے کہ اس زمانہ میں لوگوں کے دلوں میں کیا کیا خیالات اور سوالات ابھرتے ہیں اور ان کا پس منظر کیا تھا۔"[1]

ملفوظات صرف بنیادی طور پر انسان سے انسان کے درمیان تعلقات کا عمل ہے بلکہ ایک عظیم آدمی افہام و تفہیم کے لیے جو انداز اختیار کرتا ہے اس کے بارے میں بھی ملفوظات کے ذریعہ ہی معلومات حاصل ہوسکتی ہیں اس اعتبار سے ملفوظات کو آپسی روابط کا تذکرہ کہا جاسکتا ہے۔ عالمی ادبیات میں ملفوظات کے وجود اور اس پر تحریر کردہ کتابوں کا ذکر کرتے ہوئے "ملفوظاتِ آزاد" کے دیباچہ میں محمد اجمل خاں تحریر کرتے ہیں کہ

"ملفوظات کے سلسلے میں بیسیوں کتابیں فارسی اور اردو میں شائع ہوچکی ہیں۔ انہیں یوں سمجھنا چاہیے کہ جس طرح قدیم زمانہ میں مختلف لوگ کتابت یا روایت کرتے تھے۔ جیسے کاتب الواقدی یا حماد الراویہ کی روایات

---

[1] ملفوظات آزاد مرتبہ محمد اجمل خاں۔ ص ۱۱ اور ص ۱۷ مطبوعہ حالی پبلشنگ ہاوس

اسی طرح فارسی اور اردو میں مختلف اقوال و حکایات کو سن کر نقل کرنے کا نام ملفوظات پڑ گیا۔ ان ملفوظات کی صحت زیادہ تر ناقل کی ثقاہت پر مبنی ہوتی ہے..... ملفوظات کی بہت سی قسمیں کی جا سکتی ہیں۔ اب تک عموماً تصوف و مذہب کے سلسلے میں ملفوظات لکھے گئے ہیں۔" [1]

ملفوظات کے لیے انگریزی کا لفظ Gospels استعمال کیا جا سکتا ہے۔ عام طور پر Gospels انجیل کے تحریر کرنے والے چار افراد کی تحریر کی نمائندگی کرتا ہے یعنی حضرت عیسٰی علیہ السلام کے ارشادات کو Mathew کے علاوہ Mark، Luke اور Johan نے تحریر کیے جو انجیل کی شکل میں ظاہر ہوئے چونکہ ان اشخاص نے زبانی تحریر کے طریقہ کو عقیدت مندی کے طور پر کتابی شکل دی۔ اسی لیے اردو لفظ ملفوظات کا متبادل Gospels ہی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اردو ملفوظات میں بھی مرشد سے عقیدت کا رجحان نمایاں ہوتا ہے۔

Gospels کا لفظ لاطینی زبان کے لفظ Evangelium کا انگریزی ترجمہ ہے۔ Gospels کا لفظ قدیم انگریزی میں استعمال ہوتا آیا ہے۔ جو Gospels کی ترکیب کا نمائندہ God بہ معنی خدا اور Spel بہ معنی Story یا کہانی کے لیے جائیں گے۔ [2] اس طرح Godspel کو مخفف کر کے Gospel لفظ کو رواج دیا گیا۔ جس کے معنی خدا کی کہانی کے ہوتے ہیں۔ [3] لیکن دورِ جدید میں روحانی اور مذہبی شخصیات کے ارشادات کو تحریر کرنا Gospels کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

---

[1] ملفوظات از ادمرتبہ محمد اجمل خاں ص۱۱ اور ص۱۲ مطبوعہ حالی پبلشنگ ہاؤس

[2] Chamber's Twentyeith Century Dictionary page 457

[3] Concise Oxford Dictionary page . 530.

ملفوظات ایک تحریری روایت ہے جس کے ذریعہ تاریخ اور سوانح کا مواد جمع کرنے کے لیے قدیم نوادرات کا ثبوت ملتا ہے۔ ملفوظات کو ادبی حیثیت نہیں دی جاسکتی لیکن ادبی متن کی تحقیق میں ملفوظات کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ جس مقام پر تاریخ اور قدیم روایات ثبوت فراہم کرنے کے معاملہ میں دم توڑ دیتے ہیں۔ وہاں ملفوظات اپنی خصوصیات کی وجہ سے تاریخی اور سوانحی مواد کے لیے عینی گواہ کا فرض ادا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ اور ادب میں ملفوظات کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ ملفوظات کے متبادل لفظ gospels کی فنی اور ادبی تعریف کرتے ہوئے انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا میں تحریر کیا گیا ہے:

The oral Gospel was not preached in order to give historical or even biographical information niether did the Gospel litterature as the final built of early christain preaching come into existence inthe interests of history in the modern scientific (objective) science of that word. The tradition behind the Gospel was sustained at every stage for the sake of preaching and edification, with apologetic and theological modification. The gospels and the tradition behind them had a religious purpose. Nonetheless, there

some material of historical value in them. Not only do they attest the fact that Jesus was truly a historical, but also they include several historical "blocks" that are not entirely dissolved by theological interpretation. The passion narrative, for eg. and many of the sayings and parables (especially these that show series unique escha to logical conciousness.) Thus the venture of writing a life of Jesus" remans a legitimate task for the historian

But for understanding of the character of the Gospel it is important to recognize that even such historical data were handed down only as they served theological purposes and not for their own sake. This does't suggest that the essence of the gospels is spiritual

information or "enternal truth" as opposed to history. Rather it is announcement that revelation has come as the Jeses of history. The Gospels present this historical revelation in its truemeanin, i.e history in its real, theological demantion, history and theoloy.

Johan's Gospel always presents the material with its own peculiar interpretation, adding discourss from traditions that have no paralled in syneptic Gospels[ط]

انسائیکلوپیڈیا کے مرتبین نے Gospels یا ملفوظات کو عقیدت مندانہ نثر قرار دیا ہے اور اس کے ذریعہ ایسے مواد کی تشریح کا امکان ظاہر کیا ہے جس کے ذریعہ تاریخی اقدار کی وضاحت ممکن ہے۔ ملفوظات کی مثال دیتے ہوئے یہ بھی ثابت کیا گیا ہے کہ یہ درحقیقت اقوال زریں کا درجہ رکھتے ہیں جو حکایتی انداز سے بھی رونما ہوتے ہیں۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ملفوظات ایسی تحریروں کا مجموعہ ہے جس میں تاریخی تغیر کو بیان کرتے ہوئے اخلاقی یا دینی اور مذہبی اقوال کو کسی اہم شخصیت کی زبان

ط Encyclopedia of Birtanica vol-10 page - 595

سے ادائیگی کے وقت تحریری شکل میں محفوظ کرلیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے ملفوظات پیرِ طریقت کے ارشادات واقوال کا بیش بہا مجموعہ کہلائے گا جس میں اُس دور کی مذہبی، سیاسی اور سماجی تغیر کا عکس ملتا ہے جس کی وجہ سے کسی زبان اور مذہب سے تعلق اور اس کی قدامت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

سرگذشت

زندگی کے حالات اور واقعات کو تحریر کرنے کا عمل زبان و بیان کے لب و لہجہ کے علاوہ الفاظ کی خاص ترتیب و اظہار سے ہوتا ہے۔ حیات و شخصیت اور کارناموں کی پیش کشی کے مختلف انداز میں "سرگذشت" ایک طرز نگارش کی حیثیت سے اپنا مقام رکھتی ہے۔ تذکرہ نگاری کے فن کی نمائندگی میں یہ اسلوبِ نگارش خاص انداز اور فکر کی نمائندہ ہے جس کے ذریعہ دل پر گذرنے والے صدمات اور واردات کی پیش کش ممکن ہے۔ اس طرز تحریر کے ذریعہ انسان اپنے دل کی کیفیت اور مغموم و پراگندہ خیالات کے علاوہ الجھے ہوئے حالات کا ذکر کرتا ہے۔ اسی لیے اس طرز اسلوب کو "سرگذشت" کا نام دیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ اسلوب بھی ایک قسم کی سوانح ہے لیکن اس کے ذریعہ صرف وارداتِ قلبی کا ذکر ممکن ہے۔ اسی لیے یہ مختلف اسلوب کی نمائندہ ایک علیحدہ طرز تحریر قرار پاتی ہے۔

سرگذشت کا لفظ واقعہ، حادثہ یا ماجرا کے معنی کو ادا کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔[1] فارسی زبان سے اردو میں مروجہ اس لفظ کی معنوی حیثیت۔۔۔۔ دو الفاظ کی ترکیب سے عمل میں آتی ہے۔ فارسی زبان میں "سر"[2] کے معنی فکر، خیال یا

---

[1] لغات کشوری صفحہ ۳۸۰ - از تصدق حسین رضوی مطبع منشی تیج کمار لکھنؤ۔ مطبوعہ ۱۹۷۲ء

[2] " " صفحہ ۳۷۴ " "

تذکرہ کا التزام ممکن نہیں۔ اس تقاضہ کے ذریعہ تذکرہ نگار جامع اصول اور نظم وضبط کے ساتھ تخلص کے حرفِ اوّل کی رعایت یا حروف تہجی کی ترتیب کے مطابق حالات اکٹھا کرکے انھیں تذکرہ کی شکل میں پیش کرتا ہے جس سے نہ صرف ترتیب میں اصولوں کی پابندی ظاہر ہوتی ہے بلکہ بآسانی کسی بھی شاعر کے حالات ترتیب کے لحاظ سے معلوم کیے جاسکتے ہیں۔ تذکرہ میں ترتیب و تدوین کا عمل شاعر یا صوفی کے حالات اور کارناموں کی صحت کا ضامن ہے۔ یعنی تذکرہ نگار جس قدر ترتیب و تدوین میں اصول پسندی سے کام لے گا اُسی قدر اس کا تذکرہ جامع ترین قرار پائے گا۔ کیونکہ اسی عمل کے ذریعہ حالات کی تکرار اور شخصیت سے غیر متعلقہ مواد سے انحراف کیا جاسکتا ہے اس تقاضہ کے ذریعہ فنِ تذکرہ میں جامعیت اور موزوں متن کی پیش کشی کے لیے راہیں ہموار ہوتی ہیں۔

کلام کی ترتیب فنِ تذکرہ کے چھٹے تقاضہ میں داخل ہے۔ جب تک ادبی تذکروں میں شعراء کے کلام کی ترتیب کو شامل نہ کیا جائے۔ تذکرہ کی حیثیت فنّی اعتبار سے موزوں نہیں ہوگی مذہبی تذکروں میں صوفی یا ولی کی کرامت کو ترتیب میں شامل کیا جاتا ہے۔ غرض تذکرہ میں لازمی ہے کہ شاعروں کا منتخبہ کلام اور صوفی یا ولی کے منتخبہ کرامات یکجا کیے جائیں۔ جب تک اس عمل کی تکمیل نہ ہوگی تذکرہ کا فنّی تقاضہ پورا نہ ہوگا۔ جہاں تک کلام کی ترتیب اور کرامات کی پیشکشی کا تعلق ہے یہ تذکرہ نگار کا فریضہ ہے کہ وہ معیاری اور قابلِ فہم کلام اور کرامات تذکرہ میں شامل کرے۔ معیاری تذکرہ کی یہی خصوصیت اہمیت کی حامل سمجھی جاتی ہے کہ ان تذکروں میں شخصیت کے حالات کافی جانچ پڑتال کے بعد پیش کرنے کے علاوہ ان تذکروں میں شاعروں کا معیاری کلام شامل کیا جاتا ہے۔ اکثر تذکرے اس وجہ سے ادبی طور پر غیر معیاری قرار دیے گئے کہ ان میں پیش کردہ منتخبہ کلام ترتیب کے اصولوں

کی نمائندگی نہیں کرتا تھا۔ غرض ادبی تذکرہ میں معیاری کلام منتخب کرنا ایک ضروری شرط کا درجہ رکھتا ہے جس کے لیے ضروری ہے کہ ہر شاعر کا کلام اس طرح انتخاب کیا جائے کہ جس کے مطالعہ سے فن کی تمام خوبیاں اور خامیاں واضح ہو سکیں۔ یعنی انتخاب کے دوران کلام کے محاسن اور معائب پر نظر رکھنا ضروری ہے۔ صرف معیاری یا غیر معیاری اشعار کی پیش کشی انتخاب کے صیغہ میں نہیں آتی اور یہ ترتیب کے اصولوں کے مغائر ہے اس لیے تذکرہ نگار پر لازم ہے کہ وہ غیر جانب داری سے انتخاب کے تقاضہ کو پورا کرے۔

فنِ تذکرہ کا ساتواں تقاضہ تذکرہ کے اسلوب سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جس کے ذریعہ تذکرہ نگار وقائع نویسی، رنگین بیانی اور عبارت آرائی سے پرہیز کرتے ہوئے سادگی اور پرکاری کے دلکش انداز تحریر سے تذکرہ کو مزین کرتا ہے۔ تذکرہ کے اسلوب کیلئے لازمی ہے کہ ایسا انداز اختیار کیا جائے جو نہ صرف واضح ہو بلکہ دل چسپی برقرار رکھنے کا سبب بھی بنے تمام کامیاب ادبی اور مذہبی تذکرے ان خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں۔ جس کے نتیجہ میں ان کا مرتبہ کافی بلند ہے۔ تذکرہ میں اسلوب کے دوران ژولیدہ بیانی نہ صرف فنی طور پر تذکرہ کو غیر معیاری بنا دیتی ہے بلکہ اس کے ذریعہ تذکرہ کے تقاضہ کی تکمیل بھی نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ بعض دقیق قسم کے تذکرے اپنی ثقالت کی وجہ سے اردو ادب میں غیر معروف ہو گئے۔ جن تذکروں میں ان سات تقاضوں کی تکمیل نظر آتی ہے وہ فنی طور پر تذکرہ کے ضمن میں شمار کیے جائیں گے۔

تذکرہ کا لزوم

کسی زبان میں ادب کے آغاز کے ساتھ ہی اس کی اصنافِ نثر میں پیش کردہ متن پر مباحث کا سلسلہ بھی شروع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ تاریخ، سیرت، وقائع اور توزک یہ ایسے متبادل الفاظ رہے ہیں۔ جن کے بارے میں طویل بحثیں ہوتی رہی ہیں۔ عام طور پر سیرت، وقائع اور توزک کو ایک ہی سلسلے کی کڑی سمجھا جاتا ہے۔ اس پس منظر میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس تحریر پر تذکرہ کا اطلاق ہو اس کے

علاوہ کیا صرف ادبی طور پر تحریر کردہ سوانحی کتابوں کو تذکرہ کہا جائے گا۔ یہ ایسے مسائل ہیں جن پر بحث ضروری ہے تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ کن کتابوں پر تذکرہ کا فیصلہ صادر کیا جائے گا۔ بعض ناقدین نے صرف ادبی تذکروں کو "فنِ تذکرہ" کے ضمن میں شامل کیا ہے اور بعض ناقدین مذہبی تذکروں کو ادب میں شامل نہیں کرتے۔ ان حقائق کی روشنی میں لازمی ہے کہ ان خصوصیات کا جائزہ لیا جائے جنھیں بنیاد بنا کر کسی کتاب کو تذکرہ کا درجہ دیا جاتا ہے۔ عام طور پر ایسی تمام تحریریں تذکرہ کے ضمن میں آئیں گی۔ جن میں ایک سے زائد شخصیات کے حالات اور کارنامے اکٹھا کر کے کتابی شکل میں جمع کر دیئے گئے ہوں۔ اس عمل کے لیے لازمی نہیں کہ وہ شخصیتیں صرف ادبی حیثیت کی حامل ہوں بلکہ مذہبی، سیاسی، سماجی، ثقافتی غرض ہر شعبۂ حیات سے تعلق رکھنے والے متعدد افراد کے حالات اور کارنامے کسی ایک کتاب میں جمع کر دینا "تذکرہ" کہلاتا ہے۔ اس تعریف سے تذکرہ کی حیثیت واضح ہو گئی۔ چنانچہ ایسی تمام کتابیں تذکرہ کے ضمن میں آئیں گی جو کسی ایک فن میں ماہر متعدد شخصیتوں کے حالات اور کارناموں کو اپنے دامن میں جگہ دیتی ہیں۔

کسی تحقیقی کتاب، جس میں متعدد شخصیتوں کا ذکر ہو اور ان کے حالات اور کارنامے بھی پیش کیے جائیں تو اسے تذکرہ کے ضمن میں شامل نہیں کیا جائے گا کیونکہ تذکرہ کا لزوم ایسی کتابوں پر ہوتا ہے۔ جن میں حالات اور کارنامے بیان کرنے کے دوران غیر معتبر ماخذات اور مشکوک مواد درج کیا جائے۔ چونکہ تحقیقی کتابوں میں معتبر ماخذات اور جامع مواد موجود ہوتا ہے اسی لیے ان کا شمار تذکرہ میں نہیں کیا جا سکتا۔ اس عملی ثبوت سے اندازہ ہوتا ہے کہ متعدد شخصیتوں کے بارے میں سوانحی مواد پیش کرنے والی ہر کتاب پر تذکرہ کا لزوم نہیں ہوتا بلکہ ایسی کتابیں ہی تذکرہ کے ضمن میں آئیں گی جن میں حالات اور واقعات کی پیش کشی کے دوران تحقیقی

انداز روا نہ رکھا جائے بلکہ تاریخ ادب و مذہب کی ترتیب کی غرض سے کچھ اہم ادبی و مذہبی شخصیتوں کے حالات یکجا کر دیئے جائیں۔ اس پس منظر میں یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ تذکرہ نگاری کے دوران مواد کی فراہمی کو اولین درجہ نہیں دیا جاتا اور نہ ہی شخصیت کے حالات جمع کرنے کے لیے کدوکاوش کی جاتی ہے بلکہ ذیلی طور پر علم میں آنے والے حالات و واقعات ہی کو مرتب کر کے اسے تذکرہ کی شکل دے دی جاتی ہے۔ اس لحاظ سے تذکرہ میں جامع مواد کا نہ ہونا اس کی خصوصیات میں شامل ہے

فنی طور پر تذکرہ کا اطلاق ان کتابوں پر بھی ہو گا جو کئی شخصیات کے حالات بیان کرنے کی بجائے صرف شخصیتوں کی تاریخ پیدائش اور وفات درج کرنے کے بعد صرف ان کے کارنامے بیان کرنے پر اکتفا کرتی ہوں اگرچہ ان تذکروں میں شخصی حالات درج نہیں ہوتے لیکن صرف اس بنیاد پر تذکروں کے فن میں شامل ہیں کہ ان کی وجہ سے کسی عہد میں موجود مختلف فنون میں ماہر شخصیات کے علمی و ادبی کارناموں کا علم ہوتا ہے۔ عام طور پر دکن میں ایسے متعدد تذکرے لکھے گئے جن میں صرف مذہبی شخصیتوں کے نام، تاریخ پیدائش، تاریخ وفات اور تاریخ عرس وغیرہ درج ہیں۔ چونکہ یہ کتابیں دور جدید میں علماء، صوفیاء، اولیاءٔ اور شعراء کی تاریخ ترتیب دینے میں مدد دیتی ہیں۔ اسی لیے ان پر بھی تذکرہ کا لزوم ہوتا ہے۔

شاعروں اور ادبی کارنامے انجام دینے والے اشخاص کے حالات اکٹھا کر دینا ہی تذکرہ میں شامل نہیں بلکہ فنِ تذکرہ کا اطلاق ان تمام ادبی، مذہبی اور دیگر شعبۂ حیات کے کارکنوں کی تفصیلات جمع کرنے والی کتابوں پر بھی ہو گا جو مستقبل میں تاریخ کی ترتیب میں مدد دیتی ہوں۔ اس لحاظ سے تذکرہ کا لزوم صرف ادبی سوانح پیش کرنے والی کتابوں پر نہیں ہو گا بلکہ زندگی کے تمام طبقے اور شعبۂ حیات سے متعلقہ افراد کے

حالات اور کارناموں کو کتابی شکل میں ترتیب دینا تذکرہ کہلائے گا جس میں تحقیقی عمل کارفرما نہ ہو اور تدوینِ متن کے دوران روا روی سے کام لیا گیا ہو۔ غرض تذکرہ ایک ایسا عمل ہے جو بذات خود ترتیب کا کام انجام دینے کے ساتھ ساتھ مستقبل میں تحقیقی ترتیب کے لیے سازگار ماحول پیدا کرتا ہے۔ تذکرہ عملی طور پر سوانح نہیں اور نہ ہی تاریخ ہے۔ اس کا شمار وقائع اور توزک میں بھی نہیں ہوتا بلکہ تذکرہ کو "انتخابی سوانح" کا نام دیا جاسکتا ہے اور ایسی تمام کتابیں جو شخصی حالات اور کارنامے ترتیب دینے کا حق ادا کرتی ہیں۔ فنی اعتبار سے تذکرہ کے ضمن میں آتی ہیں۔

تذکرہ کی جدلیات

ادبی تحریروں میں تذکرہ، ترتیب یا انتخاب کے عمل کی نمائندگی کرنے کی وجہ سے ایک فن کا درجہ رکھتا ہے لیکن تذکروں کے مطالعہ کے بعد ناقدین اور محققین کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تذکرہ کو تخلیق کا درجہ دیں یا تالیف کی حیثیت سے اس کا مرتبہ متعین کریں۔ عموماً ہر تذکرہ میں اس کے مزاج، موضوع اور مواد پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ اور ہر تذکرہ نگار اپنے قلم کے ذریعہ موزوں شخصیت کے ادبی مزاج یا پھر اس کی مذہبی کارکردگی کے ساتھ ساتھ سوانح بھی پیش کرتا ہے۔ تذکرہ کے ان عوامل کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ تذکرہ ایک انتخابی عمل اور ترتیب کی خصوصیت رکھتا ہے۔ درحقیقت ترتیب کا عمل تالیف کا درجہ رکھتا ہے۔ تذکرہ کی حیثیت تصنیف کی نہیں اور نہ ہی اسے غیر تخلیقی کوشش قرار دیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ تذکرہ نگار صاحبِ شخصیت کی سوانح اور کارنامے بیان کرنے کے دوران تخلیقی عمل کا سہارا لیتا ہے اور بغیر اس تخلیقی قوت کے تذکرہ کی تکمیل ممکن نہیں۔ اس لیے تذکرہ تالیفی خصوصیت کا متحمل ہونے کے باوجود تخلیقی خصوصیت کا بھی حامل ہے جس کے نتیجہ میں تذکرہ ایک ایسی صنف قرار پاتا ہے جس میں تصنیف و تالیف کی خصوصیات کے ساتھ ساتھ تخلیق کے عوامل بھی کارفرما نظر آتے ہیں۔

مواد کے اعتبار سے تذکرہ کا مزاج سوانحی ہے یعنی تذکرہ میں شاعر یا صوفی کے حالات بیان کرنے کے دوران سوانحی خط و خال کو ملحوظ رکھا جاتا ہے اور تذکرہ نگار اپنی تحریر کی جولانی سے سوانحی مواد میں تخلیق کی خصوصیت کو اس طرح شامل کرتا ہے کہ تذکرہ میں ایک سے زائد شخصیات کی سوانح ہونے کے باوجود ترتیب کے دائرہ سے علیحدگی اختیار کر کے تالیف کے صیغہ میں شامل ہو جاتا ہے۔ عام طور پر کسی بھی موضوع یا عنوان پر متن کی ترتیب کا عمل "تالیف" کے شعبہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ اور یہ عمل انتخاب کی خصوصیت سے مزین ہونے کی وجہ سے تالیف ہونے کی عام صلاحیتوں کو اجاگر کرتا ہے۔ یعنی کوئی بھی کتاب جس میں ترتیب اور انتخاب کا عمل کارفرما ہوگا اسے تالیف کا درجہ دیا جائے گا۔ لیکن تذکرہ میں شعراء کے حالات کی ترتیب اور ان کے کلام کا انتخاب ہونے کے باوجود اس کا شمار ترتیب میں نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ترتیب میں متعدد اشخاص کے منتخبہ موضوعات کو جگہ نہیں دی جاتی جبکہ تذکرہ میں منتخبہ موضوعات کا نہ صرف عمل دخل ہوتا ہے بلکہ متعدد شعراء کے حالات اکٹھا کر کے تذکرہ نگار انہیں اپنی تخلیقی صلاحیت کے ذریعہ کتابی شکل میں ترتیب دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تذکرہ میں ترتیب و انتخاب کا عمل کارفرما ہونے کے باوجود اسے تخلیق کا درجہ حاصل ہے۔

فنی اعتبار سے تذکرہ کی جدلیاتی حیثیت ایک تخلیقی عمل کرتا ہے کیونکہ جب تک تذکرہ نگار کے ذہن میں شاعروں کی زندگی یا صوفیاء یا اولیاء کی کرامات کا خاکہ نہیں ہوگا اس وقت تک تذکرہ کی تحریر کا عمل بے سود رہے گا اور تذکرہ نگار لاکھ چاہتے ہوئے بھی کتاب تحریر نہ کرسکے گا جبکہ ترتیب کے دوران ذہن میں کسی قسم کا خاکہ مرتب کیے بغیر چند موضوعات کو اکٹھا کر کے کتابی شکل دی جاسکتی ہے۔ اس کے علاوہ ترتیب کے لیے چند کتابوں کے اقتباسات کا سہارا لیا جاتا ہے جبکہ تذکرہ نگاری کے دوران

اقتباسات سے مدد تو لی جاسکتی ہے۔ لیکن ان پر مکمل تکیہ نہیں کیا جاتا بلکہ تذکرہ نگار چند اہم کتابوں سے شخصیت کے سوانحی حالات اپنے ذہن میں محفوظ کر کے انہیں اپنے تخلیقی سرچشمہ کی بنیاد پر مرتب کرتا اور تحریر کی زد میں لاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تذکرہ میں ترتیب کی خصوصیت ہونے کے باوجود یہ تخلیقی سرچشمہ کا نمائندہ ہے۔

مواد اور اسلوب کی بنیادوں پر تذکرہ کی حیثیت تالیف کی ہے تذکرہ میں سوانحی حالات اور انتخاب کلام کے سوا کچھ نہیں۔ جس کے ساتھ ہی تذکرہ نگار کو اپنے اسلوب کے جوہر دکھانے کے بہت کم مواقع ہیں۔ نیز اُردو کے اکثر تذکروں میں شاعر یا صوفی کی شخصیت کے بارے میں متن کی حیثیت ذیل میں آتی ہے۔ یعنی تذکرہ نگار سوانحی خاکے نہیں بناتا بلکہ شخصیت کی زندگی کے حالات کے چند اہم کارنامے ضبط تحریر میں لاتا ہے۔ جس میں اسلوب کی تلاش اور اس کی منفرد مزاجی کو ٹٹولنا ایک مشکل امر ہے۔ کیونکہ تذکرہ نگار شخصی حالات کے دوران ایجاز و اختصار سے کام لیتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ تذکرہ میں اکثر شخصیت کو حالات کی لپیٹ میں بتایا جاتا ہے جو تخلیقی کارنامے کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ ایسا فعل ترتیب میں اختیار نہیں کیا جاسکتا کیونکہ تالیف کے انتخاب اور ترتیب کے دوران مؤلف کو اپنے قلم کی جادونگاری دکھانے کا موقع نہیں ملتا اور تذکرہ میں چونکہ تذکرہ نگار کو اپنے تخلیق کے گوشوں کو واضح کرنے کی پوری سہولت دی جاتی ہے اور تذکرہ نگار اسے اپنی مرضی کے موافق استعمال کرتا ہے۔ اسی لیے تذکرہ فنی طور پر "تخلیق" کا درجہ رکھتا ہے اور اس فن میں ترتیب اور انتخاب کی خصوصیت ہونے کی وجہ سے یہ مکمل تالیف ہونے کی دلالت کرتا ہے۔

تذکرہ کا معیار

فن اور فن کی جانچ کے پس منظر میں جب تنقیدی رویہ اختیار کیا جاتا ہے۔ تو سب سے پہلے فن کے معیار سے بحث کی جاتی ہے۔

ادبی طور پر تذکرہ ایک فن اور تخلیقی صلاحیت قرار دیئے جانے کے بعد اس کے معیار اور مسائل پر بحث بھی لازمی ہے۔ ناقدین اُردو، ادبی طور پر کسی ایک تذکرہ کو اہمیت کا حامل قرار دیتے ہیں جبکہ دوسرا تذکرہ ان کی نگاہوں میں جچنے نہیں پاتا جو اس بات کا ثبوت ہے کہ جب تک تذکرہ کا معیار نہ دیکھا جائے اس کی حیثیت اور مرتبہ کا تعین مشکل ہوجاتا ہے۔ فنی طور پر ہر تذکرہ اپنا معیار رکھتا ہے اور اپنے مخصوص مزاج اور ماحول کے ساتھ عہد کی ترجمانی کرتا ہے۔ فن اور معیار کے پس منظر میں تذکرہ تخلیقی سرچشموں تصنیف، تالیف اور ترتیب جیسی خصوصیات میں تالیف کی حیثیت رکھتا ہے اور ایک عمدہ تالیف کی حیثیت سے تذکرہ کا معیار متعین کرنا ادبی جائزے کے مترادف ہے!

ادبی، سیاسی اور مذہبی طرز و انداز کے نمائندہ تذکروں کا معیار مؤلف کی جدت پر منحصر ہوتا ہے۔ تذکرہ کے معیار کو جانچنے کے لیے بیان، متن اور ترتیب کے طریقہ کار سے بحث کی جاتی ہے۔ جس تذکرہ میں بہتر بیان، جامع متن کے ساتھ ترتیب کا انوکھا انداز روا رکھا جائے وہ فنی طور پر معیاری تذکرہ قرار پائے گا۔ ان اصولوں سے کمتر درجہ کے تمام تذکرے اگرچہ فنی لوازمات کی پابجائی کریں گے۔ لیکن معیاری نہیں قرار دیئے جاسکتے۔ ہر دور میں متعدد تذکرے لکھے گئے لیکن ان تمام تذکروں میں انفرادی حیثیت کا حامل تذکرہ ہی معیاری قرار دیا جاتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جس تذکرہ نگار نے اصولِ تدوین کو پوری طرح سلوک میں لایا وہی کامیاب تذکرہ نگار قرار دیا گیا اور اس کا تالیف کردہ تذکرہ فنی اور ادبی طور پر معیاری تذکرہ کے ضمن میں شمار کیا گیا جو اس بات کا ثبوت ہے کہ نمائندہ تذکرے فنی معیار کے متقاضی ہوتے ہیں اور جن تذکروں میں اس معیار کی پابجائی نہیں ہوتی۔ وہ تذکرے کے فنی معیار پر پورے نہیں اُترتے۔

تذکرہ کے معیار سے مراد اس فن کو بلندی پر پہنچانے کے لیے اختیار کردہ وہ عمل ہے جو تذکرہ کے دوران اختیار کیا جاتا ہے۔ عام طور پر فن کی اصولی ترتیب ہر تذکرہ میں پائی جاتی ہے۔

اور ہر تذکرہ اسی مقصد کے تحت لکھا جاتا ہے کہ اس میں تذکرہ کے فن کے تمام اصولوں کو بروئے کار لایا جائے۔ لیکن بہت کم تذکرے ایسے ہوتے ہیں جو اس معیار پر پورے اترتے ہیں۔ فنّی طور پر تذکرہ کا تمام اصولوں کی پابجائی کرنا تذکرہ کا معیار کہلائے گا۔ اور اسی معیار کی بدولت تذکرہ کی جانچ پڑتال کی جاتی ہے۔ چونکہ تذکرہ تصنیف اور ترتیب سے ہٹکر تخلیقی سرچشمے تالیف سے متعلق ہے۔ اسی لیے اس کے معیار کی جانچ کے لیے تالیفی اصولوں کو روا رکھا جاتا ہے۔ جس تذکرہ میں ترتیب کا بہترین طریقہ جامع سوانحی مواد اور موزوں زبان و بیان کا سہارا لیا جائے۔ وہ نہ صرف معیاری تذکرہ کہلائے گا بلکہ اس کی وجہ سے ادب میں بھی اضافہ ہوگا۔

تذکرہ کے فنّی جائزے میں جہاں اس کے فن سے معلومات حاصل کی جاتی ہیں وہیں تذکرہ کے تقاضے کے علاوہ تذکرہ کے اطلاق اور اس کی جدلیاتی حیثیت سے بھی بحث کی جاتی ہے۔ جب ان تمام خصوصیتوں کی جھلک تذکرہ میں موجود ہوگی تو معیاری طور پر اس تذکرہ کا مرتبہ بلند ہوگا۔ اور فنّی اعتبار سے تذکرہ کی ہیئت بھی سامنے آئے گی۔

ادب میں تذکرہ کا مرتبہ

ہیئتی اعتبار سے ادب کی تمام اصناف تخلیقی رجحان کی ترجمان ہوتی ہیں۔ داستان، ناول، افسانہ، ڈرامہ اور شاعری کے تمام اصناف تخلیقی سرچشمے ہیں۔ ان کے برخلاف سوانح، تذکرہ، سفرنامہ اور آپ بیتی کا شمار تالیف میں ہوتا ہے۔ ادبی طور پر تذکرہ کی حیثیت ایک مکمل تالیف کی ہے جس میں بسا اوقات تذکرہ نگار اپنی جدّت طبع سے تصنیف کی خصوصیت لانے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن ترتیب اور انتخاب کے متن کی کثرت کی وجہ سے تذکرہ کو ادبی طور پر تصنیف کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ تذکرہ میں تالیفی خصوصیات پوری طرح موجود ہوتی ہیں۔ سوانح کا بیان اور تذکرہ نگار کا اسلوب اگرچہ تذکرہ کو تصنیف کے قریب کرتے ہیں لیکن تاریخ اور سنین کے ساتھ ہر سال کے واقعات

اور زندگی کے اہم کارناموں کو پیش کرنے کے دوران تذکرہ نگار، انشا پردازی کے جوہر بھی دکھاتا ہے۔ یہ انداز تذکرہ کو تصنیف سے قربت بخشتا ہے۔ لیکن ترتیب و تدوین کے علاوہ تذکرہ کا بیشتر حصّہ انتخاب سے متعلق ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادب میں تذکرہ کا مرتبہ تالیف کی حیثیت سے نمایاں ہے۔

فنّی اعتبار سے تذکرہ نگاری ایک مجمع اور مرکب صنف ہے جس میں انتخاب کی صلاحیت بھی موجود ہے اور ترتیب کا سلیقہ بھی جس کے ساتھ ہی انشا پردازی اور اسلوب کے جوہر بھی تذکرہ کی صنف میں شامل ہیں۔ سوانحی مواد اور تاریخی جائزہ بھی تذکرہ کی صنف کا ایک جز ہے ان بنیادی خصوصیات کی بنا پر تذکرہ ادب کی ایک صنف ہونے کے علاوہ شخصیت کی ہمہ گیری کو کتابی شکل میں پیش کرنے کا دعویدار بھی ہے۔ اگرچہ شخصیت کے حالات پیش کرنے میں ایجاز و اختصار کی وجہ سے شخصیت کے بعض گوشے پنہاں رہ جاتے ہیں۔ لیکن اس نقص کے باوجود بھی تذکرہ ادبی طور پر ایک صنف کا مرتبہ رکھتا ہے اور یہ ایسی فعال صنف ہے کہ جس کی وجہ سے تاریخ مرتب کرنے میں مدد ملتی ہے۔ اور عہد قدیم میں شعر گوئی اور شاعرانہ چشمک کے علاوہ مشاعروں کی روایت کے بارے میں بھی تذکروں سے ہی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ادب میں تذکرہ کا مرتبہ ایک صنف اور تالیف کی حیثیت سے قبول کیا جاتا ہے۔ جس کے ساتھ ہی افادیت کی بنیادوں پر تذکرہ فنّی طور پر ادبی تاریخ یا مذہبی تاریخ مدون کرنے کا بہترین اور معتبر ذریعہ بھی ہے۔

باب دوم

تذکرہ نگاری کے اقسام

تذکرہ تحریر کرنے کی خصوصیات میں مختلف اسلوب مروج ہیں۔ ان میں طرز تحریر کے لحاظ سے چیدہ چیدہ فرق بھی پایا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ تمام اسلوبات مکمل طور پر سوانح کے فن سے وابستہ ہیں لیکن ان کی تحریروں کے انداز میں فرق اور اصولوں کی تبدیلی کی وجہ سے انہیں مختلف عنوانات سے مربوط کیا گیا ہے۔ تذکرہ نگاری کا مقصدی پہلو سماج کی سربراوردہ اشخاص کی زندگی اور حالات کے علاوہ کارناموں کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی سوانح پیش کرتا رہا۔ لیکن اصول پسندی اور شعوری ارتقاء تکمیلی حیثیت میں نہ ہونے کی وجہ سے سوانح نگاری روایتی طور پر تذکرہ کے روپ میں ترقی کرتی رہی اور یہی تذکرہ کا فن مختلف انداز سے اسلوب کو بدلتا ہوا متفرق عنوانات کا حامل رہا۔ یہی وجہ ہے کہ "اردو تذکرہ نگاری" کا تحقیقی و تاریخی جائزہ لیا جائے تو یہ فنی طور پر مختلف اقسام میں تبدیل ہو کر اپنے اسلوب کی علیحدہ خصوصیت کی نمائندگی کرتا ہے۔

تذکرہ نگاری ایک ضمنی صنف کا درجہ رکھتی ہے۔ جس کی جدید ترقی یافتہ شکل سوانح نگاری آج کے ادبیات کی مقبول ترین صنف ہے۔ تذکرہ تحریر کرتے ہوئے اردو کے سوانحی ادب کے معماروں نے علیحدہ علیحدہ انداز اور مختلف طرز تحریر کو روا رکھا۔ یہاں تک کہ یہ جداگانہ اسلوب عنوانات کے اعتبار سے منفرد طرز نگارش کا علمبردار قرار پایا۔ اردو تذکرہ نگاری کی ابتداء اور ارتقاء کا جائزہ لیا جائے تو یہ محسوس کیا جا سکتا ہے کہ تذکرہ کا فن اگرچہ

ابتدائی طور پر شخصیات و حالات کے ذکر کے لیے مختص رہا لیکن رفتہ رفتہ اس طرز تحریر میں نمایاں فرق محسوس کیا جانے لگا اور پھر تذکرہ نگاری کی مختلف صنف اقسام اور متبادلہ اسلوب سے وابستہ ہوگئی۔

تذکرہ کا فن صاحب شخصیت کی زندگی کے حالات اور کارناموں کے پیش کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ جس میں تحقیقی اور استدلالی اصول کی کمیابی بری طرح کھٹکتی ہے۔ اور جب یہی تذکرہ شخصیت کے کارناموں اور حالات کو پیش کرتے ہوئے تحقیقی اور حقائق پسندانہ طرز نگارش سے قربت حاصل کرتا ہے تو سوانح حیات کو BIOGRAPHY کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ جب سوانح حیات کی تحریر میں خود کی زندگی کا عکس ذاتی قلم سے رونما ہو تو ایسی تحریر "خود نوشت سوانح" یا AUTOBIOGRAPHY کہلاتی ہے۔ جس میں ایک شخص اپنے حالاتِ زندگی اپنے قلم سے پیش کرنے کی جسارت کرتا ہے۔ اگر اس فن تحریر میں حافظہ پر زور دے کر بکھری یادوں کو سوانحی شکل دی جائے تو یہ انداز یادداشت نگاری (REMINISCENCE) کہلاتا ہے۔ عام طور پر روزمرّہ حالات تحریر کر کے اسے مبسوط کتاب کی شکل دے دی جائے تو یہ انداز روزنامچہ DIARY کہلائے گا۔ انسان کی زندگی کے حالات بیان کرتے ہوئے سفر کی دشواریوں اور حالاتِ سفر کا ذکر کسی تحریر کی خصوصیت قرار پائے تو اس انداز کو سفرنامہ TRAVELOGUE کہا جائے گا۔ قدیم تحریروں میں کسی فرد کا ذکر یا فنّی طور پر کسی اہم واقعہ کی جانب اشارہ ہو تو یہ انداز ملفوظ نگاری GOSPELS کہلاتا ہے۔ اسی طرح انسان اپنے غمزدہ حالات کا ذکر کسی کے روبرو کرے تو اس طرز و انداز کو سرگزشت کہا جائے گا۔ اس طرح تذکرہ نگاری کا فن سات مختلف اندازِ تحریر کا نمائندہ ہے۔ جس کو فن اور اصول کی روشنی میں درج کیا جاتا ہے۔

۱۔ سوانح نگاری BIOGRAPHY

۲۔ خود نوشت سوانح نگاری AUTO BIOGRAPHY

۳۔ یادداشت نگاری (REMINISCENCE)

۴۔ روزنامچہ (DIARY)

۵۔ سفرنامہ TRAVELOGUE

۶۔ ملفوظات نگاری GOSPELS

۷۔ سرگذشت UTTERANCE

سوانح نگاری

انسان کی زندگی کا جائزہ تاریخ اور عہد کی روشنی میں پیش کرنا ادبی بنیادوں پر خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ عام طور پر جب کسی انسان کی زندگی کو بحث کا موضوع بناتے ہوئے انسانی زندگی کے اہم مواد کو بیانی شکل دی جائے تو یہ اظہار ادب میں "سوانح نگاری" کہلاتا ہے۔ سوانح نگاری نہ صرف ایک مکمل صنف ہے بلکہ دورِ جدید کی سب سے کامیاب طرزِ تحریر کا درجہ رکھتی ہے۔ ادبی طور پر اردو نثر میں سوانح نگاری کا سلسلہ تذکرے سے جاملتا ہے یعنی اُردو ادب میں سب سے پہلے انسان کی زندگی اور اس کے حالات کو تحریری روپ دینے کے لیے تذکرہ نگاری کا رواج ہوا۔ اس لحاظ سے سوانح نگاری اردو تذکرہ کی ترقی یافتہ اور قابلِ قبول صنف ہے جس نے نہ صرف تذکرہ کی قدامت کو موہوم کردیا بلکہ اپنے پس منظر میں تحقیقی مواد اور سائنسی استدلال رکھنے کی وجہ سے اُردو میں تذکرہ نگاری کی صنف معدوم ہونے لگی اور سوانح نگاری نے عام شہرت حاصل کرلی۔ لیکن اردو کا نقاد اِن حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا کہ اُردو ادب کی قدیم صنف تذکرہ کو جدید لوازمات سے آراستہ کرکے اُسے دورِ جدید میں سوانح نگاری کے فن سے موسوم کیا جانے لگا۔ اس اعتبار سے سوانح نگاری بنیادی طور پر تذکرے کے فن سے استفادہ کرتی اور اسی فن کی ایک مستبدلہ صنف ہونے کا درجہ رکھتی ہے۔

سوانح نگاری کسی شخصیت کی داستانِ حیات کو قلمبند کرنے کا ایک

ایسا طریقہ ہے جس میں پیدائش سے لے کر موت تک کے حالات کو مبسوط شکل دے کر زمانے کے تغیرات ، معاشرے کی زبوں حالی اور رسم و رواج کے ردّ و بدل کا شخصیت پر اثر بتایا جاتا ہے یا پھر شخصیت کی وجہ سے زمانہ میں رونما ہونے والے تغیرات کو تاریخ اور عہد کے ساتھ بیان کرنا سوانح نگاری کہلاتا ہے یعنی اس فن کے ذریعہ ایک انسان کی زندگی کو دور اور عہد کے بندھنوں میں باندھ کر شخصیت کے زمانہ پر تغیرات اور انقلابات کے شخصیت پر اثرات سے بحث کی جاتی ہے۔ اور انسانی حیات کو قابل قبول بنانے کے لیے شخصیت کے اخلاق و کردار کو بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے سوانح نگاری ایک ایسی صنف نثر ہے جس کے ذریعہ شخصیت کی حیات کو تحریری شکل دی جاکر اس کی زندگی کے قیمتی واقعات کو اصول پسند زندگی کا مظہر بنایا جاتا ہے۔ سوانح عمری اسی وجہ سے قیمتی صنفِ سخن ہے کہ اس کے ذریعہ تاریخ، شخصیت کردار، سیرت اور فطرت کی بھرپور نمائندگی ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دورِ جدید میں سوانح نگاری کے فن کو انسانی حیات کی پیش کشی کا معیار سمجھا جاتا ہے۔ فنِ سوانح نگاری کے بارے میں مختلف نظریات پائے جاتے ہیں۔ اس فن کی تعریف کرتے ہوئے کہا گیا ہے۔

"سوانح عمری تاریخ کی وہ شکل ہے جو انسانی نسلوں اور گروہوں سے نہیں بلکہ افراد سے متعلق ہے یا یہ کہ سوانح عمری ایک انسان کی پیدائش سے موت تک کے افکار و افعال کا بیان ہے یعنی حقائق کے ساتھ کردار اور ذہن کی نشوونما کا مرقع ہے۔ انسان کی شخصیت کی تصویر ہے اور داخلی احساسات کی کہانی ہے۔ آکسفورڈ ڈکشنری میں اس کی تعریف یہ ہے کہ سوانح عمری بطور ایک ادبی صنف کے افراد کی زندگی کی تاریخ ہے کہ اس میں تین لوازم تاریخ، فرد اور ادب بتائے گئے ہیں۔" ؎۱

؎۱ "Dictionary of world literature by Joseph T. Shipley Article "Biography"

کارلائل کے نزدیک "سوانح عمری ایک انسان کی حیات ہے اسی طرح ایک اور تعریف میں کہا گیا ہے کہ "سوانح عمری ایک انسان کی تاریخ ہے" ان تعریفات سے پتہ چلتا ہے کہ سوانح نگاری بنیادی طور پر کچھ اصولوں کی پابند اور نظریاتی قیود کی نمائندگی کرتی ہے۔ یہ فن مذہبی، اخلاقی، تاریخی اور سائینسی سوانح عمریوں کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔

سوانح نگاری کا موضوع غیر معمولی قوتِ اظہار اور عظمت کا متلاشی ہوتا ہے یعنی سوانح نگاری نہ صرف موضوع کے اعتبار سے غیر معمولی اظہار کی قوت کو پسند کرتی ہے بلکہ شخصیت کے اوصاف حمیدہ اور شخصیت کی عظمت کو بھی بحث کا موضوع بناتی ہے۔ اسی لیے سوانح نگاری کو عظیم شخصیتوں کے موضوع کردار اور کارنامے کا مرکب کہا جاتا ہے جس میں آنے والی نسلوں کی دلچسپی کو متحرک کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس تحریک کی صلاحیت کو واضح کرنے کے لیے فنِ سوانح نگاری کامل طور پر موضوع، مواد اور بیان کی ضرورت کی متلاشی ہوتی ہے"[1]

اس فن میں صرف عظیم شخصیت کی جسامت کو موضوع بحث نہیں بنایا جاتا۔ بلکہ لطیف و نازک احساسات، ہمدردانہ جذبات، زندگی کی پر معنی مسرت اور عملی زندگی میں پیش آنے والی مشکلات اور جدوجہد کا ذکر بھی کیا جاتا ہے۔ مجموعی اعتبار سے سوانح عمری عوامی زندگی اور نجی تعلقات کو پیش کرنے والی ایک ایسی تحریر ہے جس میں شخصیت کے حالات اور اس کی زندگی میں پیش آنے والے تمام واقعات کو کتابی شکل دی جاتی ہے۔ اسی لیے سوانح عمری کو "اذ جھولا تا ڈولا" تمام اہم واقعات کو پیش کرنے کا فخر حاصل ہے۔ اس طرح سوانح عمری کا فن شخص کی زندگی کی ابتدا سے آغاز کے مراحل طے کرتا ہوا اس کی موت پر اختتامی درجہ کو پہنچتا ہے۔ اس فن میں شخصیت کی حیات کو پیش کرنے والا اپنی تحریر اور اپنے منفرد اسلوب سے فن کو مکمل طور پر ادبی بنا دیتا ہے یعنی سوانح نگاری کے فن میں صرف عظیم شخصیت کی زندگی اور کارناموں ہی کو اہمیت حاصل

---

[1] اردو میں سوانح نگاری از سید شاہ علی ص ۱۱

ادبی تاریخ کا نمائندہ ہو جاتا۔

اردو کے ادبی تذکرے شعرائے اُردو کی تاریخ مدون کرنے کے علاوہ اردو شاعری کی درباروں تک رسائی کی بھی وضاحت کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ شعرا میں آپسی چشمک اور ادبی معرکوں کے بارے میں بھی صرف تذکروں کے ذریعہ ہی معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔ اس عمل کے ذریعہ تذکرہ نویس کا مقصد کسی بادشاہ کے دربار کی تاریخ مرتب کرنا نہیں ہوتا لیکن اردو کے ادبی تذکروں کے مطالعہ سے یہ عمل واضح ہو جاتا ہے کہ اُردو شعرا کی درباروں تک رسائی کے وقت ہندوستان میں بادشاہت ایک پرآشوب دور سے گذر رہی تھی اس کے ساتھ ہی اردو کے ادبی تذکروں کے ذریعہ یہ معلومات بھی حاصل ہو جاتی ہیں کہ بادشاہوں کے دربار میں کس قسم کے محرکات غالب تھے۔ اگرچہ دبستان دہلی اور دبستان لکھنو کے عہد کی نمائندگی مختلف تاریخی کتابوں میں بھی ملتی ہے لیکن اردو کے تذکروں میں لکھنو اور دہلی کے دبستانوں نے اُردو کی ترقی کے پس پردہ جس قدر عیش پرستیاں کیں ان کا پورا اظہار ملتا ہے۔ دربار کے آداب و مراتب سے لے کر بادشاہ کی علم دوستی اور ادب نوازی کی تمام تر تاریخ صرف اردو کے تذکروں کی مدد سے ہی مرتب کی جا سکتی ہے جبکہ تاریخ کی کوئی کتاب درباروں میں پیش آنے والے ادبی معرکوں کی تفصیلات پیش کرنے سے اور یہ اہم فعل اردو کے ادبی تذکرے انجام دیتے ہیں۔

سماجی تذکرے

اردو تذکروں کی فہرست میں چند ایسے تذکرے بھی دستیاب ہوئے ہیں جن میں تاریخی استدلال کی چھاپ اور ادبی چاشنی زیادہ ہے۔ عام طور پر ایسے سوانحی حالات جن میں کسی سماج کے اکابرین مصلحین اور ان کے کارناموں کو پیش کرنے کا بیڑا اٹھایا جاتا ہے۔ سماجی تذکرے کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یعنی سماجی تذکرے ایسے تذکرے ہیں جن میں کسی مذہبی

یا ادبی شخصیت کی سوانح درج نہیں ہوتی بلکہ بھلائی اور بہبود کی غرض سے کام کرنے والے افراد کی سوانح لکھ کر ان کے کارناموں کو سراہا جاتا ہے۔ ایسی شخصیتیں مذہبی بھی ہو سکتی ہیں اور ادبی بھی۔ لیکن ان کے کارنامے مذہب و ادب سے زائد بھلائی کی کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ایسے افراد کی زندگی کے بارے میں تذکرے لکھنا سماجی تذکرہ نویسی کہلاتا ہے۔ اس طرز کی تذکرہ نویسی میں شخصیت پر کارناموں کا اثر غالب رہتا ہے۔ اس لیے تذکرہ نویسی کارناموں کے پس پردہ شخصیت کو ابھار کر انسانوں کو ترغیب دلاتا ہے کہ وہ بھی فلاح و بہبود کے لیے کام کریں۔ سماجی تذکروں کے لیے یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ کسی مذہب یا ذات سے تعلق رکھنے والے فرد یا افراد کے بارے میں تذکرہ تحریر کیا جائے بلکہ اس اسلوب تذکرہ نویسی کے دوران تمام عالمی مذاہب سے تعلق رکھنے والے مصلحین کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ اس قسم کے تذکرے ادبی طور پر اہمیت کے حامل نہیں ہوتے لیکن ان کے ذریعہ سماج کی اصلاح ممکن ہے۔ اسی لیے ان تذکروں کے بارے میں بھی گروہی تقسیم کے دوران مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اردو تذکروں کی گروہی تقسیم کے دوران وعظ و نصیحت عقائد و فتاویٰ۔ فقہ و مذہب اور حدیث و روحانیات سے تعلق رکھنے والے افراد کی زندگی کے بارے میں مرتب کردہ سوانحی کتاب کو "مذہبی تذکرہ" کا نام دیا گیا جبکہ ادبی اور علمی تحر کے علاوہ شعر و شاعری اور زبان و ادب سے دلچسپی رکھنے والے افراد کی حیات کے بارے میں تفصیلات درج کرنے والی کتاب کو "ادبی تذکرے" کے نام سے یاد کیا گیا اور تعلیمی، اصلاحی اور اخلاقی بنیادوں پر کام کرنے والے افراد کی زندگیوں کے بارے میں مرتبہ تحریر کر کے ان کی سوانح کے بارے میں انتخاب پیش کرنا "سماجی تذکرے" کہلاتا ہے۔

اردو تذکروں میں سماجی تذکروں کا اثر تقریباً گم نام رہا کسی بھی تذکرہ نویس نے اس طرز پر قدیم دور میں سوانح مرتب کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ دور قدیم میں مذہب اور

ادب سے لگاؤ کی وجہ سے تمام مذہبی اور ادبی شخصیتوں کو جنہوں نے سماجی طور پر
بھی کارنامے انجام دیئے۔ انہیں ادب اور مذہب میں شامل کر دیا گیا۔ جس کی وجہ سے
دورِ قدیم کے تذکروں کو علیحدہ کرنا ایک مشکل امر ہے۔ لیکن اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں
کی جا سکتی کہ سماجی کارناموں کا اثر اور انہیں ادب اور مذہب سے علیحدہ کرنے کا تصور
دورِ جدید کی پیداوار ہے جس کی وجہ سے اردو کے قدیم تذکروں میں سماجی تذکروں
کا عمل دخل کسی طرح بھی واضح نہیں ہوتا۔ پھر بھی چند تذکرے ایسے ضرور مل جاتے ہیں
ہیں جن میں ادب اور مذہب سے زیادہ سماجی کارناموں پر زور دیا گیا ہے۔ یہ تذکرے قلمی
نسخوں کی شکل میں مختلف کتب خانوں کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ فارسی میں اس قسم کے
تذکرے کم یاب رہے ہیں۔ اردو زبان نے بھی چونکہ تذکرہ نویسی کا فن فارسی سے سیکھا ہے
اسی لیے سماجی تذکروں کا شعور اردو تذکروں میں بھی واضح نہیں۔

اُردو کے بعض تذکرہ نویسوں نے سماجی کارناموں کو پیش کرنے کے لیے سماج
کے چند مشترکہ کارناموں پر تذکرے تحریر کیے جن میں سماج پسند نظریات واضح ہوتے ہیں۔
ابتدائی طور پر اردو میں سماجی تذکروں کی بنیاد مسجدوں اور مندروں کی تاریخ مرتب کرنے سے
ہوئی۔ اردو کے تذکرہ نویسوں نے مختلف علاقوں میں موجود مذہبی عبادت گاہوں کے بارے
میں تفصیلات اکٹھا کرنے کی بنیاد رکھی جو آخر میں عبادت گاہوں کے تذکرے کی حیثیت
حاصل کرتے گئے۔ درحقیقت اردو میں سماجی تذکرے سرد سے ریکارڈ یا دستاویز کی
حیثیت رکھتے ہیں جن میں تذکرہ کی نمائندگی سے زیادہ تاریخی عکس شامل رہتا ہے۔ دہلی اور
لکھنؤ میں اس قسم کے تذکرے کمیاب رہے۔ سر سید احمد خاں نے "آثار الصنادید" لکھ کر
اردو میں سماجی تذکروں کی بنیاد رکھی۔ اگرچہ آثار الصنادید ایک تاریخی نوعیت کی کتاب
ہے جس میں اسلاف کی تعمیر کردہ عمارتوں کی تاریخ درج ہے۔ لیکن اسے ایک سماجی تذکرہ
اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ سر سید نے اس کتاب میں سماج کے عہد رفتہ کے کارنامے

کو سراہنے کے لیے دستاویزی حیثیت دے دی ہے۔ آثار الصنادید ایک تاریخی کتاب ہے جو دہلی کی قدیم عمارتوں کی یاد تازہ کرنے کی وجہ سے اس کتاب میں سماجی تذکرے کے عکس کی نمائندگی ملتی ہے۔ اس کتاب کے ذریعے گذرے ہوئے سماج کی تعمیر پسندی کا علم ہوتا ہے اور یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ قدیم معماروں نے دو تہذیبوں کے امتزاج سے طرز نو کی عمارتیں تعمیر کیں چونکہ سماجی تذکروں میں ایک سے زاید تہذیبوں کے امتزاج کو سوانحی بنیادوں پر پیش کیا جاتا ہے اور اس کا عکس آثار الصنادید میں موجود ہے اس لیے ہم اس کتاب کو اردو کا بہترین سماجی تذکرہ قرار دے سکتے ہیں کیونکہ سرسید نے اس کتاب میں ہندو اور مسلمان اہلِ ثروت افراد کی تعمیر کردہ عمارتوں کی تاریخ درج کی ہے جو سماجی اصولوں کی نمائندہ ہے۔ اسی خصوصیت کی بنا پر آثار الصنادید ایک سماجی تذکرے کی حیثیت حاصل کر لیتی ہے۔ اردو میں اس معیار کا سماجی تذکرہ ابھی تک نہ لکھا جا سکا۔

ہندوستان میں سماجی تذکروں کو فروغ دینے والے نثر نگاروں میں سید محی الدین کا شمار بھی ہوتا ہے جنھوں نے "آثار الاوثان" لکھ کر اردو میں سماجی تذکروں کی روایت کو فروغ دیا۔ "کتاب الاوثان" کی اشاعت عمل میں نہ آسکی۔ یہ مخطوطہ کی حیثیت سے سالار جنگ میوزیم کے کتب خانے میں محفوظ ہے جس کا داخلہ نمبر ۱۰۲۰ ہے۔ اس کتاب میں تاریخی انداز سے سید محی الدین نے پہاڑوں پر قائم مندروں کا ذکر کیا ہے اور مختصر تعارف کے ذریعہ ان مندروں میں موجود مورتیوں کی تاریخ بھی درج کی ہے۔ دو حصوں پر مشتمل یہ کتاب سنہ ۱۲۳۱ھ کے بعد تصنیف ہوئی جس کے ذریعہ مصنف نے ہندوستان کی ان دیولوں کا تذکرہ کیا ہے جو پہاڑوں میں پتھروں کو تراش کر بنائی گئی ہیں۔[1] اس

---

[1] کتب خانہ نواب سالار جنگ مرحوم کی اردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست۔ از نصیر الدین ہاشمی صفحہ نمبر ۸۱۹۔ مطبوعہ مطبع ابراہیمیہ ۱۹۵۷ء

کتاب سے دور قدیم کی صناعی اور قدیم سماج کی مذہب پرستی کا علم ہوتا ہے۔ اگرچہ آثارالاوثان ایک تاریخی نوعیت کی کتاب سمجھی جا سکتی ہے۔ لیکن اسے سماجی تذکرے میں اس لیے شامل کیا جاتا ہے کہ یہ کتاب ان مندروں کا تذکرہ کرتی ہے جن میں سماج کے افراد کی مشترکہ کوشش کو دخل ہے یعنی چونکہ مصنف نے اس کتاب میں مندروں کا ذکر کیا ہے جہاں سماج کے ہر طبقہ کے لوگ بطور عقیدت جاتے ہیں اور یہاں پر کسی قسم کی سماجی تفریق نہیں امیر اور غریب چھوٹا اور بڑا غرض ہر فرد مندر سے رغبت رکھتا ہے اسی لیے آثارالاوثان کو ایک سماجی تذکرے کی حیثیت دی جاتی ہے۔ گو کہ اس تذکرے میں ایک مذہب کے افراد کی عقیدت کا ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن اسے مذہبی تذکرے کی نوعیت اس وجہ سے نہیں دی جا سکتی کہ یہ تذکرہ ہندو مذہب کے ہر طبقے کے افراد کی یکجہتی کی نمائندگی کرتا ہے۔ جو مندر کے سامنے اپنی عقیدت کو پیش کرتے ہیں۔ ہندو مذہب کے ہر طبقہ کی یادگار کی حیثیت سے آثارالاوثان ایک اہمیت کی حامل کتاب ہے اسی لیے اسے تاریخ سے زیادہ سماجی تذکرے کی حیثیت سے قبول کرنا ضروری ہے۔

اُردو کے سماجی تذکروں میں چند ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں جو سماج کے مختلف طبقات کی نمائندہ ہیں۔ سماجی تذکرے کی تعریف اس طرح بھی کی جا سکتی ہے کہ یہ تذکرے درحقیقت کسی قوم یا مذہب کے مختلف طبقات کی یک جہتی کے نمائندہ ہوتے ہیں اور ایسی تحریریں جن میں بین طبقاتی یا بین قومی تعلقات کو اُجاگر کیا جائے وہ کامل طور پر سماجی تذکروں کی سرشت میں شامل ہوں گے۔ اگر کسی ایک مذہب کی مختلف یادگاروں کو تاریخی شواہد کے ساتھ ضبط تحریر میں لایا جائے تو ایسی مرتبہ کتاب مذہبی تذکرے میں شامل نہیں کی جائے گی اور نہ ہی اس کا شمار تاریخ میں کیا جائے گا بلکہ یہ کسی قوم یا مذہب کی نمائندگی کرنے کی وجہ سے اور ایک ہی مذہب کے مختلف طبقات کی مذہبی وابستگی کے اظہار سے اس کی حیثیت تذکرے کی ہو جاتی ہے۔ اُردو میں سماجی تذکرہ کا شعور

صرف چند کتابوں کی حد تک محدود ہے۔ لیکن یہ قطعی نہیں کہا جا سکتا کہ اردو کے تذکرہ نویسوں نے سماجی تذکرے نہیں لکھے۔ اتنا ضرور ہے کہ اردو کے سماجی تذکروں میں ان تمام اصولوں کی نمائندگی نہیں ملتی جو کہ ایک سماجی تذکرہ کی ضروریات ہیں۔ اردو تذکرے مکمل طور پر نہ سہی لیکن جزوی طور پر سماجی تذکروں کی تشکیل کا حق ضرور ادا کرتے ہیں۔ جن میں سماج کا عکس اور اس کی مشغولیات کی پیش کشی نمایاں ہے۔

انسائیکلوپیڈیائی تذکرے

تذکروں کی گروہ بندی میں ایک ایسا طرز بھی شامل ہے جس کے ذریعہ تذکرہ نگار شاعروں کے تذکروں کے لیے ان کی سوانح کا انتخاب حروف تہجی کے کے اعتبار سے کرتا ہے۔ انسائیکلوپیڈیائی تذکرے میں ایسے تمام سوانحی کارناموں کا شمار کیا جا سکتا ہے جن میں تذکروں کا ذکر ابجدی حروف پر ہو۔

انسائیکلوپیڈیائی تذکرے ان تذکروں کو کہا جاتا ہے جو الف تخلص سے شروع ہونے والے تمام شاعروں کے تخلص سے لے کر یا سے شروع ہونے والے تخلص سے لے کر یا سے شروع ہونے والے تخلص کے شاعروں کی زندگی اور کارناموں کے بارے میں مواد فراہم کرے یعنی ایک ایسی مبسوط کتاب جس میں ترتیب وار شاعروں کے تخلص کے اعتبار سے الف سے لے کر یا ے تک کی تمام صاحب شخصیت شعراء کی زندگی کے حالات درج ہوں تو ایسا تذکرہ انسائیکلوپیڈیائی تذکرہ کہلائے گا بعض تذکروں میں تخلص کی ترتیب کے ساتھ ساتھ نام کے اعتبار سے بھی حروف تہجی کی ترتیب کو ملحوظ رکھا گیا ہے اسی اعتبار سے انسائیکلوپیڈیائی تذکرے میں وہ تمام شعراء کے کارنامے اور ان کی زندگی کے حالات پیش کیے جائیں گے جن کے نام یا تخلص کا آغاز الف سے یا ے تک ترتیب وار درج کیا گیا ہو۔

حروف تہجی کے اعتبار سے شاعر و ادیب کی زندگی کے حالات ترتیب

دنیا اور ان کے کارناموں کو اختصار سے بیان کرنا قدیم زمانے ہی سے ممدوح رہا۔ ایک معنی میں اس قسم کے تذکرے لغت یا قاموس کی ترتیب کو روا رکھتے تھے جس کا مقصد تذکرے کی ترتیب میں سہولت اور قاری کے لیے بیشتر مواد فراہم کرنا ہوتا تھا۔ فارسی میں لغت کی ترتیب کے اعتبار سے بہت سے تذکرے لکھے گئے چنانچہ اردو زبان میں بھی ایسے تذکروں کی کمی نہیں جو انسائیکلوپیڈیائی اساس پر لکھے گئے ہیں۔ فارسی کے زیر اثر اردو کے تذکرہ نویسوں نے بھی لغوی ترتیب سے تذکروں کی روایت کو فروغ دیا۔ اور اس کے نتیجہ میں انسائیکلوپیڈیائی تذکرے عالم وجود میں آئے۔ عبدالجبار ملکاپوری کی کتاب "تذکرہ شعرائے دکن" اسی اصول پر ترتیب دیا ہوا تذکرہ ہے جس میں شاعروں کی سوانح کو حروف تہجی کی ترتیب میں پیش کیا ہے۔ اردو کے بیشتر تذکرے حروف ابجد کی ترتیب کے نمائندہ ہیں۔ میر حسن کا تذکرہ بھی انہی اصولوں کا پابند ہے۔ متعدد اردو کے تذکرے شخصیت کی سوانح بیان کرتے وقت ابجدی ترتیب کو روا رکھتے ہیں۔ قدیم دور میں اردو کے جتنے بھی تذکرے لکھے گئے وہ کسی عہد یا زمانے سے متعلقہ شاعروں یا ادیبوں کی زندگی بیان کرنے سے متعلق تھے۔ لیکن جب تذکرہ نویسی ایک فن کی حیثیت سے عام ہونے لگی تو تذکرہ نویسوں نے شعرا کی زندگی اور کارناموں کو عہد وار ترتیب دینے کی بجائے حروف تہجی کی اساس پر ترتیب دینے کا طریقہ اختیار کیا۔ فارسی کے تذکرہ "ید بیضا" اسی نوعیت سے ترتیب دیا گیا ہے۔ غلام علی حسینی واسطی بلگرامی جن کا تخلص آزاد تھا انھوں نے اس تذکرے میں حروف ابجد کی ترتیب کو ملحوظ رکھتے ہوئے فارسی کے ۱۲۷۳ شعرا کی سوانح لکھی۔ اسی طرح "بہارستانِ سخن" بھی انسائیکلوپیڈیائی انداز پر لکھا گیا ہے۔ جس کے مرتب میر عبدالرزاق الحسینی الخوفی ہیں۔ فارسی کے یہ تذکرے مخطوطات کی شکل میں سالار جنگ میوزیم لائبریری میں ۵۴۵ اور ۵۵۵ نمبر کے حوالے کے ساتھ محفوظ کیے گئے ہیں۔ اردو میں انسائیکلوپیڈیائی اساس پر تذکرہ نویسی کی روایت

کو مکمل طور پر عبدالجبار ملکاپوری نے سلوک میں لایا چنانچہ ان کا تذکرہ "تذکرہ شعرائے دکن" دو جلدوں میں اسی طرز کی عکاسی کرتا ہے۔

الجبدی ترتیب سے لکھے جانے والے تذکرے درحقیقت صاحب شخصیت کی زندگی کے حالات اور کارناموں کو پیش کرنے کے معاملے میں اصول پرستی کے نمائندہ ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان تذکروں کے ذریعہ کسی دور یا زمانے کی عکاسی نہیں ہوتی بلکہ ایسے تذکروں میں ابتداء سے تذکرے کی تحریر کے وقت تک کے تمام نامور شاعر اور ادیب کے کارناموں کو ترتیب وار پیش کیا جاتا ہے اردو میں ابتدائی طور پر انسائیکلوپیڈیائی تذکروں کی کمی کی ایک وجہ یہ بھی رہی کہ ابتدائی عہد میں شعراء کی کثیر تعداد موجود نہیں تھی انسائیکلوپیڈیائی تذکرے کی سب سے بڑی ضرورت حروف تہجی کے اعتبار سے شاعروں کی تعداد میں کثرت لازمی ہے۔ اگر شاعروں کی تعداد کم ہوگی تو لازمی طور پر انسائیکلوپیڈیائی تذکرے کے اصول کی نمائندگی میں فرق آجائے گا کیونکہ الف سے یا تک کے الفاظ کو اپنا تخلص بنانے والے شعراء کی سوانح جمع کرنا اردو کے ابتدائی دور میں ایک مشکل کام تھا اسی لیے اردو تذکرہ نویسی میں حروف تہجی کے اعتبار سے کم تذکرے لکھے گئے لیکن شاعروں اور ادیبوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے بعد یہ طریقہ بآسانی روبہ عمل لایا جاسکا۔

اردو کے مذہبی، ادبی اور سماجی تذکروں سے بالکل مختلف انداز انسائیکلوپیڈیائی تذکرہ کا ہوتا ہے۔ درحقیقت انسائیکلوپیڈیائی تذکروں میں شخصیت کے بارے میں اہم معلومات فراہم کرنا ہوتا ہے۔ چنانچہ ان تذکروں میں شاعر یا ادیب کی تاریخ پیدائش، مختلف سنین میں ان کے کارنامے، شعر و ادب سے دلچسپی اور آخر میں وفات کے علاوہ ان کا منتخبہ کلام درج کیا جاتا ہے۔ اس کا مقصد شاعر کی طویل سوانح لکھنا نہیں بلکہ شاعر یا ادیب کی زندگی پر مختصر لیکن جامع مواد فراہم کرنا ہوتا ہے۔ اسی ایک خصوصیت کی وجہ انسائیکلوپیڈیائی تذکرے دیگر تذکروں کے مقابلہ میں

اولیت حاصل کر لیتے ہیں۔ انسائیکلوپیڈیائی تذکرہ کی وجہ سے قارئین کو کئی سہولتیں فراہم ہوجاتی ہیں۔ وہ بطور حوالہ اس تذکرے کا استعمال کر سکتے ہیں اور صرف شاعر کے نام اور تخلص سے واقفیت کی بنیاد پر انسائیکلوپیڈیائی تذکرے کو بطور حوالہ استعمال کر کے بڑی ہی آسانی کے ساتھ شاعر و ادیب کی زندگی کے حالات سے واقفیت حاصل کر سکتے ہیں۔ اسی سہولت کی وجہ سے دور جدید میں علم و فن کی معلومات اکٹھا کرنے کے لیے انسائیکلوپیڈیا لکھے جاتے ہیں۔

اردو کے تذکروں میں کسی جامع انسائیکلوپیڈیائی تذکرے کا ذکر نہیں ملتا اور نہ ہی اُردو تذکروں میں کوئی ایسا باوثوق تذکرہ لکھا جا سکا ہے جو انسائیکلوپیڈیا کے اصولوں کی ترجمانی کرتا ہو۔ دور قدیم کے تذکروں میں تحقیقی مواد اور تنقیدی عکس کی کمی ہے اور جتنے بھی تذکرے لکھے گئے وہ شخصی تذکرے بن کر رہ گئے۔ دور جدید میں ٹھوس تحقیقی بنیادوں پر انسائیکلوپیڈیائی تذکرے کی روایت کو فروغ دینے کی ضرورت ہے تاکہ اردو کے شعراء اور ادیبوں کی سوانح کے بارے میں کوئی ایسی مبسوط کتاب قارئین اُردو کے سامنے رکھی جاتی جو بیک وقت اُردو کے تمام شاعروں اور ادیبوں کی سوانحی تاریخ پیش کر سکے۔ یہ کام اردو کے انسائیکلوپیڈیائی تذکر ہی انجام دے سکتے ہیں جس کو دور جدید میں "سوانحی " کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔

انسائیکلوپیڈیائی تذکرے متنی کتب Reference books کا درجہ رکھتے ہیں۔ جن کے ذریعہ علم افزا معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔ یہ تذکرے دورِ جدید کے تقاضوں کی تکمیل اور موجودہ علمی اور ادبی تاریخ مدون کرنے کا ذریعہ ہیں۔ جو بیک وقت علمی اور تحقیقی معلومات فراہم کرنے کے علاوہ ادب کی تاریخ، شاعروں اور ادیبوں کی سوانح اور عہد بہ عہد زبان و ادب کی ترقی کے بارے میں مفصل معلومات کے علاوہ ادبی اصناف اور نثر و نظم کی تشکیل کے بارے میں تحقیقی مواد فراہم کرتے ہیں۔ اس ہمہ جہتی معلومات کو یکجا کرنے کی وجہ سے انسائیکلوپیڈیائی تذکرے کسی بھی ادب کی لازمی ضرورت قرار دیئے جا سکتے ہیں۔

صنفی تذکرے

اردو تذکروں کی گروہی تقسیم کے دوران تذکروں کی ایک ایسی قسم بھی دستیاب ہوی جنہیں صنفی تذکرے کا نام دیا جاسکتا ہے۔ صنفی تذکرے ایسے متن یا مواد کی نمائندگی کرتے ہیں جن میں شعراء کی سوانح اصنافِ نثر و نظم کے اعتبار سے ترتیب دی جاتی ہے یعنی اصناف شعری جیسے مثنوی، مرثیہ، قصیدہ، نظم اور غزل جیسے عنوانات قائم کرکے صنفی تذکروں میں مثنوی مرثیہ گو، قصیدہ گو، نظم اور غزل گو شعراء کی سوانح صنف واری ترتیب سے پیش کی جاتی ہے جس کا مقصد مختلف اصناف میں طبع آزمائی کرنے والے شاعروں اور ادیبوں کی مبسوط سوانح ترتیب دینا ہوتا ہے تاکہ قارئین کو کسی زبان کے ادب میں نمائندہ شعراء کے معیار کا علم ہوسکے۔

صنفی تذکرے فن تذکرہ نگاری کے ایسے تذکرے ہیں جن میں شاعروں اور ادیبوں کی زندگی کے حالات اور کارنامے نظم و نثر کے اصناف کے پس منظر میں درج کیے جاتے ہیں۔ عام طور پر اس طریقہ ترتیب کا مقصد ادب میں کسی صنف کی ترقی اور اس کی ابتدا کے بارے میں معلومات فراہم کرنا ہوتا ہے۔ ایک لحاظ سے یہ تذکرے اصنافِ ادب کے بارے میں مختصر لیکن جامع مواد فراہم کرنے کا ذریعہ بھی ہوتے ہیں جس میں صنف کے بارے میں مواد کے ساتھ ساتھ شاعر اور ادیب کی زندگی کے الات بھی درج کیے جاتے ہیں تاکہ زندگی و ادب کی ترقی میں حصہ لینے والے شاعر یا ادیب کی حیثیت سے واضح ہوسکے۔

اردو کے تذکروں میں اگرچہ مختلف اصناف ادب سے تعلق رکھنے والے افراد اور نمائندہ شعرا و ادباء کی زندگی کے بارے میں مواد دستیاب ہوتا ہے لیکن اصناف نثر و نظم کی بنیادوں پر تذکرے تحریر کرنے کی روایت اردو میں کم یاب رہی۔ دورِ جدید کے محققین نے کسی قدر اس جانب توجہ دی لیکن دورِ قدیم میں کوئی ایسا مواد

دستیاب نہیں ہوتا جن میں صنفی تذکرے کی خصوصیات موجود ہوں۔ فارسی میں ایسے کئی تذکرے تحریر کیے گئے۔ سالار جنگ میوزیم لائبریری کے شعبۂ مخطوطات میں کئی ایسے تذکرے موجود ہیں جو فارسی زبان میں تذکرے کی اس روایت کو پیش کرنے کے نمائندہ ہیں۔ خاص طور پر میر عبدالرزاق حسینی لغائط ۱۱۷۱ھ مطابق ۱۷۵۸ء کا مشہور مخطوطہ بہارستانِ سخن" اسی نوع کا ایک اہم تذکرہ ہے جس میں تذکرہ نگار نے گیارہ فصلوں میں صنفی خصوصیات کے اعتبار سے تذکرہ نگاری کی روایت کو پیش کیا ہے۔ مخطوطہ نمبر ۵۵۵ فارسی کی فہرست میں یہ تذکرہ اس لیے اہمیت رکھتا ہے کہ اس کے مرتب نے اصناف کی خصوصیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس تذکرے کی ترتیب پر خصوصی توجہ دی ہے۔ گیارہ فصلوں کے درمیان کلام منظوم، فن عروض، فن قافیہ، اقسام شعر، استحسان کلام صنائع و بدائع، علم انشار، در خط، حروف و اعراب املا اور قواعد لغت کے ذریعہ تذکرہ نگار نے پوری طرح صنفی تذکرے کی نمائندگی کی ہے۔

اُردو میں اس قسم کے تذکرے کم یاب رہے ہے۔ لیکن دور جدید کے محققین نے اس قبیل کے تذکروں کو رواج دینے کی کوشش کی۔ نصیر الدین ہاشمی کی کتاب "دکنی مخطوطات" یہ ادبی مباحث" اردو صنفی تذکرے کی نمائندہ ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں کی "اردو غزل" تحقیقی پس منظر میں۔ صنفی تذکرے کی نمائندگی کرتی ہے۔ دورِ قدیم میں تحریر کردہ سید فتح علی حسینی گردیزی کا "تذکرۂ ریختہ گویاں" اردو شاعری کی صنف ریختہ گوئی کے شاعروں کے تذکرے کا نمائندہ ہے۔ دورِ جدید میں تاریخ ادب تحریر کرنے کے رواج کی وجہ سے صنفی تذکروں میں کسی قدر کمی واقع ہوئی۔ میر سے لے کر دتاسی اور کریم الدین کے عہد تک اردو میں جتنے بھی تذکرے تحریر کیے گئے ان میں شاعروں اور ادیبوں کی زندگی کے حالات تحریر کرکے ان کا منتخب کلام درج کیا گیا۔ صنفی تذکرے میں شاعروں کی سوانح اصناف کی اساس پر درج کی جاتی ہیں کیونکہ دورِ قدیم میں اُردو شاعری غزل اور مثنوی

سے منسلک رہی اسی لیے اردو میں صنفی تذکرے کی روایت عہد قدیم میں نہ پڑ سکی۔ زیادہ تر غزل گوئی کی روایت کا عام رواج رہا اسی لیے اردو کے قدیم تذکرے صرف ادبی بنیادوں پر تحریر کیے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ دورِ قدیم میں صنفی تذکروں کی کمی محسوس کی جاتی ہے۔ لیکن موجودہ دور میں تحقیقی نوادرات کی ترقی کی وجہ سے صنفی تذکرے تاریخ ادب کی حیثیت سے تحریر کیے جا رہے ہیں۔ اردو کے صنفی تذکروں کے نمائندہ تذکرہ نگار عبدالغفور نساخ اور محسن لکھنوی سمجھے جاتے ہیں جن کے "قطعہ منتخب" اور "سراپائے سخن" کافی مشہور ہیں۔ ان تذکروں کے ذریعہ تذکرہ نگاروں نے قطعہ گو شاعروں کو اعضائے جسمانی کو بطور ردیف استعمال کیے جانے والے اشعار یا غزلوں کا انتخاب پیش کیا ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اردو میں صنفی تذکرے بھی تحریر کیے گیے۔ دور جدید میں صنفی تذکروں کو ہیئتی تذکرے کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔

آئینی تذکرے فن عروض اور قواعد کے بارے میں تحریر کردہ تمام تذکروں کو اردو تذکروں کی گروہی تقسیم میں آئینی تذکرہ کا درجہ دیا جاتا ہے۔ اسی کتاب میں جن میں فن عروض، علم ادب، الفاظ کے محاسن و معائب اور اشعار کے اوزان کے بارے میں تفصیل درج ہو۔ انہیں آئینی تذکرے کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔ ان تذکروں میں علم بیان اور علم بدیع کا ذکر ہوتا ہے جس کے ذریعہ شاعر یا ادیب کو اضافات، بحریں اور اوزان سکھائے جاتے ہیں۔ جس کے ساتھ ساتھ الفاظ کے صحیح استعمال کے علاوہ لفظی و معنوی خوبیوں سے واقف کاری کے لیے شاعر کی حرکات اور سکنات اور لے اور ترنّم کے اصول پر وزن کے تعین اور تشخیص کا سلیقہ سکھایا جاتا ہے۔ درحقیقت آئینی تذکرے نہ صرف فن عروض اور علم بحر کی تاریخ ہوتے ہیں بلکہ ان کے ذریعہ اختصار اور جامعیت کے اصول کی پابجائی بھی ہو سکتی ہے یہی وجہ ہے کہ آئینی تذکرے شعر کے مختلف ارکان تقطیع ترتیب ارکان کا التزام شعر کے لیے مناسب بحر اور

ارکانِ شعر سے بحث کرتے ہوئے اُردو تذکروں میں قواعد سے منسلک ہوجاتے ہیں اور ایک مختلف قسم کے تذکرہ کی روایت کو فروغ دیتے ہیں۔ فن عروض پر تحریر کردہ کتابوں کو ایک تذکرہ کی حیثیت سے اس لیے مقام دیا جاتا ہے کہ درحقیقت اسی کتابوں کے ذریعہ فنِ عروض کی بحث کے ساتھ ساتھ مستند اور معتبر شعراء کے اشعار کی تاریخ مدوّن کرنے کا کام لیا جاتا ہے۔

اُردو میں آئینی تذکروں کا رواج دورِ قدیم سے ہی رہا۔ مختلف افراد نے شاعریٔ عروض اور بلاغت کے بیان میں تذکرہ نگاری کے فن کو برقرار رکھا۔ لاتعداد کتابیں آئینی تذکرے کے فن کی نمائندگی کرتی ہے۔ فنِّ عروض کی تعریف و توصیف میں لکھی گئی کتابوں میں شیر محمد خاں کی "گلدستہ گفتار" مخطوطہ کی شکل میں سالار جنگ میوزیم لائبریری میں ۴۵۷ پر محفوظ ہے۔ اسی طرح مظفر علی خاں اسیر کی کتاب "زرِ کامل عیار مترجمہ معیار الاشعار" بھی اُردو کے آئینی تذکروں میں شمار کی جاسکتی ہے جس میں مصنّف نے اُردو عروض اور قوافی کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ یہ مخطوطہ بھی سالار جنگ میوزیم لائبریری میں محفوظ ہے۔ شمس الدین فیض کی کتاب "دستور الشعراء و خزینۃ الامثال" بھی اُردو کے محاورے اور فنِ عروض سے متعلق تفصیلی تذکرہ کرنے والی کتاب کا درجہ رکھتی ہے جو مخطوطہ کی شکل میں سالار جنگ میوزیم لائبریری کے شعبۂ مخطوطات میں محفوظ کی گئی ہے

ان قدیم آئینی تذکروں کے علاوہ دورِ جدید میں فنِ عروض اور صنائع و بدائع پر کئی کتابیں شائع ہوگئیں جو تحقیقی انداز کو پیش کرنے کی وجہ سے آئینی تذکرے کے اصول سے خارج ہوگئیں کیونکہ آئینی تذکرے صرف فن، بحر اور اوزان کے علاوہ محاورات کی تفصیل درج کرتے ہیں جبکہ دورِ جدید کی فنِ عروض پہ تحریر کردہ کتابیں کسی قدر تحقیقی مواد کو اپنائے ہوئے ہیں اسی لیے "رہنمائے عروض" از منشی سید علی اور خواجہ عشرت لکھنوی کی تناعر پر کتابیں آئینی تذکرے کا درجہ حاصل نہیں کرسکتیں۔

اردو تذکروں کو متن کی پیش کشی کے اعتبار سے انہیں چھ مختلف ناموں یعنی مذہبی تذکرے، ادبی تذکرے، سماجی تذکرے، انسائیکلوپیڈیائی تذکرے، صنعتی تذکرے اور آئینی تذکرے سے موسوم کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے اردو میں تحریر کردہ تذکروں کی درجہ بندی کا علم ہوتا ہے۔ درحقیقت یہ درجہ بندی اردو تذکروں کے موضوع اور خصوصیات کی آئینہ دار ہے۔ جس سے فن تذکرہ کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

••

حصہ چہارم

دکنی تذکروں کا آغاز و عہد

دکن میں اُردو ادب اور زبان کا آغاز شمالی ہند سے قبل ہوا جس کے باعث دکن کو اردو کی شروعات میں اولیت کا مرتبہ حاصل ہے۔ دکن میں اُردو کی جو قدیم شکل رائج رہی اسے دور جدید کے محققین نے دکنی کا نام دیا ہے۔ گو کہ دکنی زبان اُردو سے رابطہ رکھتی ہے لیکن مقامی بولیوں کے اثرات کی وجہ سے دکنی ادب میں کسی قدر عمومیت پائی جاتی ہے۔ اس حقیقت سے انحراف نہیں برتا جا سکتا کہ اُردو کی داغ بیل سب سے پہلے دکن میں پڑی اور اُردو کا ابتدائی ادب "دکنی ادب" کہلاتا ہے۔ اسی دکنی ادب کی وجہ سے اُردو کی لسانی حیثیت متعین ہوتی ہے اور اسے ایک ہندوستانی زبان قرار دینے کے علاوہ اس کے ادب کو اردو کے لیے ابتدائی مزاج بنانے اور اُردو کو فروغ دینے کے لیے سازگار ماحول پیدا کرنے کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔

دکنی دور میں غزل گوئی، مثنوی نگاری، قصیدہ گوئی اور مرثیہ کے علاوہ تذکرہ نگاری پر بھی زور دیا گیا ہے۔ دکن میں اُردو کے آغاز کے بعد سب سے پہلے شعر و شاعری کا چرچا رہا۔ غزل گوئی اور مثنوی نگاری دکن کی شاعری کی مقبول اصنافِ سخن رہیں۔ شعر گوئی سے دل چسپی کے نتیجے میں دکنی دور اردو نثر میں زیادہ خدمات انجام نہ دے سکا۔ پھر بھی ملا وجہی کی "سب رس" خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی متنازعہ کتاب "معراج العاشقین" اور دیگر مذہبی رسالوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ دکنی دور میں نثری خدمات مذہبی کتابوں اور رسالوں کی حد تک محدود رہیں۔ چند ایک لوگوں نے دکنی میں

داستان، تفسیر، حدیث، اخلاقی رسالے، فنونِ لطیفہ، قصص، سیرت، مناقب اور تذکرے تحریر کرکے دکنی ادب میں نثری کارناموں کی نمائندگی اس طرح دکن میں اُردو کے آغاز و عہد کے طویل دور میں نثری کارناموں کی حیثیت بے مایہ ہے۔ لیکن اس قدیم دور میں نثر کی طرف توجہ دینا بھی کسی کارنامے سے کم نہیں۔

اردو نثر میں دکن نے جو خدمات انجام دیں ان میں تذکرہ نگاری کا فن ایک مخصوص زاویہ کے ساتھ ابتدائی مدارج سے نکل کر ترقی کی راہوں پر طرف گامزن نظر آتا ہے۔ دکن میں تذکرے کی روایت کے آغاز و عہد کو یہاں قائم شدہ مختلف حکومتوں کے دور سے وابستہ کیا جاسکتا ہے۔ دکنی تذکرے ابتدائی طور پر اپنے پورے فنی نقوش کے ساتھ اردو نثر میں اپنا مقام نہیں بناتے بلکہ دکنی میں ابتدائی طور پر تحریر کردہ تذکروں کے مطالعہ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ دکن میں بھی تذکرے کا فن فارسی تذکروں سے استفادہ کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اس میں وہ تمام نقائص موجود ہیں جو شمالی ہند کے تذکروں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ دکن میں تذکروں کا آغاز عہد عالمگیری کے بعد ہوا۔ اور خواجہ خاں حمید الدین قاقشال کا تذکرہ "گلشنِ گفتار" شعرائے دکن کا پہلا تذکرہ تصور کیا جاتا ہے جو ۱۱۶۵ھ م ۱۷۵۲ء میں عالمِ وجود میں آیا۔ تذکرے کی روایت کو دکن میں فروغ دینے کے لیے جو نمایاں کوششیں کی گئیں انہیں مختلف ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ دکنی تذکروں کا آغاز اور اس کا عہد مکمل طور پر دکنی ریاستوں سے منسلک ہے جو بہمنی سلطنت کے اختتام کے بعد معرضِ وجود میں آئیں۔ اسی لیے دکن میں تذکروں کے آغاز اور اس کے عہد کو مختلف علاقوں کے اعتبار سے درباروں اور بادشاہوں کے عہد سے وابستہ کیا جاتا ہے۔ دکن میں تذکرہ نگاری کی روایت کے ادوار حسب ذیل ہیں۔

۱۔ قطب شاہی دور

۲۔ عادل شاہی دور

۳- نظام شاہی دور

۴- بریدشاہی دور

۵- عالمگیری دور

۶- آصف جاہی دور

چونکہ ان ادوار میں تذکرہ نگاری کے فن کو فروغ دینے کی کوشش کی گئی اور مختلف نثر نگاروں نے دکن کے شعراء کے بارے میں سوانحی مواد دستیاب کر کے انہیں ایک مبسوط کتاب کی شکل میں مرتب کرنے پر خصوصی توجہ دی۔ اس لیے اُردو تذکروں کے آغاز و عہد کو دکن میں چھ ادوار سے وابستہ کیا جاتا ہے۔ اگرچہ اس دور میں فارسی زبان میں بھی تذکرے لکھے گئے۔ لیکن انہیں اسی لیے ان ادوار سے بحث کرتے وقت زیر تنقید نہیں لایا جارہا ہے کہ عنوان کے مطابق دکنی تذکرے زیر بحث ہیں۔

۱- قطب شاہی دور:

بہمنی سلطنت کا شیرازہ بکھر جانے کے بعد دکن میں قائم ہونے والی پانچ سلطنتوں میں سے قطب شاہی سلطنت بھی ایک سلطنت ہے جو دکن میں سب سے زیادہ ادبی کارنامے انجام دینے کا سبب بنی یہ سلطنت ۱۵۱۸ء میں قائم ہوئی اور اس سلطنت سے وابستہ بادشاہوں نے نو مولود زبان و ادب کی ترقی و ترویج میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بادشاہوں کے دربار سے اہل کمال اور اہلِ فن منسلک رہے۔ شاہانہ سرپرستی کی وجہ سے مختلف شاعر و ادیب درباروں سے وابستہ رہے اور بادشاہوں نے انہیں خلعتیں دے کر اعلیٰ منصب پر فائز کیا۔ یہی نہیں بلکہ شاعروں اور ادیبوں نے قطب شاہی دور سے وابستہ ادب اور شاعری کی ترقی و ترویج میں دکنی زبان کے ذریعہ اپنا حق ادا کیا۔ لاتعداد مثنویاں، کئی مایہ ناز کتابیں اور متعدد نثری کارنامے

اس عہد سے وابستہ ہیں قطب شاہی سلطنت کا اختتام ۱۶۸۷ء میں ہوا قطب شاہی بادشاہوں نے گولکنڈہ کو اپنا پایۂ تخت بنا کر دکنی سلطنتوں میں بلند مقام حاصل کرلیا۔ مجموعی اعتبار سے قطب شاہی سلطنت ۱۷۹ سال تک قائم رہی اور اس عہد میں غزل، مثنوی، داستان، تذکرہ اور دیگر مذہبی مسائل پر کتابیں تحریر کرنے کا سلسلہ جاری رہا۔ اس دور کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ نثر کے مقابلے میں نظم کو فروغ حاصل ہوا اور دکنی زبان کو ایک ادبی حیثیت حاصل ہوگئی۔

عہدِ قطب شاہی میں نثری کارنامے کسی حد تک محدود رہے اُردو کی معرکتہ الآرا داستان ملا وجہی کی "سب رس" اسی دور کی یادگار ہے تذکرے کا رواج اس عہد میں خال خال ہی رہا۔ لیکن مذہبی علماء اور صوفیائے کرام نے وعظ و پند کے ذریعہ جو خدمات انجام دیں انہیں محفوظ کرنے کا تصور قطب شاہی دور سے وابستہ رہا۔ تذکرہ نگاری کی ابتدائی شکل "ملفوظات" اس عہد میں عالم وجود میں آئی۔ دکنی نثر میں ملفوظات کی حیثیت مکمل فنی نہیں بلکہ فارسی اور عربی تحریروں کے درمیان دکنی جملے اور قدیم نہج سے وابستگی رہنے والے ایسے الفاظ اس دور میں تذکرے کی ابتدائی ہیئت کی نمائندگی کرتے ہیں جیسے ملفوظات کا ابتدائی درجہ کہا جاسکتا ہے۔ قطب شاہی دور میں تذکرہ نگاری کی روایت ابھی اپنے آغاز کے دور میں تھی۔ دکنی اصحاب نے پیر و مرشد کے بیانات کو قلمبند کرنے کی روایت کو اس دور میں پروان چڑھایا۔ اور اس انداز کو ملفوظات کی شکل میں نثری حیثیت دی گئی۔ قطب شاہی دربار سے بلند پایہ شاعر اور ادیب وابستہ رہے۔ اعلیٰ درجہ کی اردو نظم و نثر میں کتابیں لکھی گئیں اور علم و فضل اور شعر و سخن کی قدر و منزلت کی گئی۔ لیکن صوفیا اور مذہبی علماء درباروں سے وابستہ نہ رہے بلکہ انہوں نے دکنی عوام کے دلوں پر حکمرانی کا طریقہ اپنایا۔ چنانچہ سید بلاقی شاہ راجوؔ، میراں جی

خدانما، میراں یعقوب، شاہ افضل قادری، شاہ عالم، عرف شاہ منجھن، شاہ قطب الدین، وجیہہ الدین گجراتی، امیر خسرو، خواجہ مسعود سعد، سلطان بو علی قلندر پانی پتی۔ شرف الدین یحییٰ منیری۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہی، شاہ باجن، قاضی محمود دریائی علی جیو گام دھنی۔ میراں شمس العشاق اور برہان الدین جانم یہ ایسے صوفیائے کرام تھے جن کے ملفوظات میں تذکرے کی روایت کا عکس ملتا ہے۔ ۱۴۰۰ء سے ۱۶۰۰ء تک ملفوظات، لغات اور کتبوں سے بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی "تاریخ ادب اردو میں" تحریر کرتے ہیں کہ:

> "تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں قوالی کا رواج عام تھا۔ اور یہ قوالیاں عام طور پر ہندوی زبان میں ہوتی تھیں تاکہ ہر طبقے کے لوگ ان سے کیف و سرور حاصل کر سکیں"۔ [۱]

قطب شاہی دور میں تذکرے اور ملفوظات کی روایت فارسی کتابوں میں دکنی جملے تحریر کرنے سے ترقی پاتی رہی۔ اس دور کے صوفیا اور علما نے دکنی یا ہندوی زبان کو بطور ملفوظات کے استعمال کیا۔ یہ ملفوظات مبسوط کتاب کی شکل میں نہیں بلکہ فارسی نثر کے دوران دکنی میں تحریر کر دیئے گئے ہیں۔ قطب شاہی دور میں جو فارسی کتابیں تحریر کی گئیں اور جن میں دکنی الفاظ اور جملے بطور ملفوظات کے استعمال ہوئے ہیں۔ ان کی تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

مرأۃ احمدی:

فارسی میں تحریر کردہ یہ کتاب اگرچہ تذکرہ یا مکمل ملفوظات کا درجہ نہیں رکھتی لیکن اس

۱

کتاب کی تحریر کے دوران چند ایسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جنہیں ملفوظات کے صیغہ میں شمار کیا جا سکتا ہے جس سے تذکرے کی ابتدائی روایت کا پتہ چلتا ہے۔ ۱۵۱۶ء میں شاہ عالم عرف شاہ منجھن نے چند ایسے جملے بطور بیان پیش کیے جو اس کتاب میں موجود ہیں اور اس دور کی عام بول چال کی زبان پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اور پتہ چلتا ہے کہ تذکرے کی روایت دورِ قطب شاہی سے پہلے بھی ملفوظات کی شکل میں ترویج پاتی ہے۔ چونکہ ملفوظات تذکرے کی ایک شکل کا درجہ رکھتے ہیں۔ اسی لیے انہیں تذکرے کی صنف سے وابستہ کر کے ان کتبوں اور جملوں کو بطور سند پیش کیا جا رہا ہے جو صوفیا اور اولیائے کرام کی زبان سے ادا ہوئے۔ ان جملوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ فارسی کتابوں میں ایک نئی بولی جانے والی زبان کے الفاظ ملفوظات کی شکل میں تذکرے کی روایت کو قائم کر رہے تھے۔ ایسی ہی کتابوں میں "مرأۃ احمدی" کا شمار کیا جاتا ہے جو دکنی زبان اور الفاظ کی نمائندگی کرتی ہے۔ ذیل میں اس کتاب کے فارسی جملوں کے درمیان حضرت شاہ منجھن کے ملفوظات کے دکنی جملے تحریر کیے جاتے ہیں۔

۱۔ "کیا ہے، لوہ ہے کہ لکڑ ہے کہ پتھر ہے"[۱]

۲۔ "چستیوں نے پکائی۔ اننے بخاریوں نے کھائی"[۲]

۳۔ "جو راجن جی او نہایا ہووے تو تجھ جیسے فقیروں کی برسوں تپس کنا سی کرے"[۳]

۴۔ حضرت شاہیہ ایستارا در حجرہ مبارک خود بردہ بزبان ہندی مناجات نمودند

کہ راجن بگردتی بدل بگردتا، فرمودن ہمایوں بود"[۴]

---

[۱] خاتمہ مرأۃ احمدی (جلد سوم) صفحہ ۲۷ مطبع حسینی اثنا عشری بمبئی۔

[۲] خاتمہ مرأۃ احمدی۔ ص ۴۷

[۳] " " " ص ۴۸

[۴] " " " ص ۴۰

۵۔ "انھوں کو کیا کشف ہوے یا نہ ہوے کام اس کا ہے۔" [۱]

۶۔ "قاضی محمود از غلبات عشق پیوستہ بر حسب حال نقش عاشقانہ بہ عبارت ہندی در مقامات ہندیہ بطرز دل پسند می بست۔" [۲]

ان جملوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مراۃ احمدی کی تحریر میں بیان کے دوران تعدادایسے جملے بکثرت استعمال ہوے ہیں جن میں قدیم دکنی کا اثر غالب ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ فارسی تحریروں کے درمیان دکنی الفاظ اور جملے تحریر کرنا ایک نئی زبان کی شروعات کی داغ بیل صوفیائے کرام کی تحریروں سے دکن میں پڑ چکی تھی۔ مراۃ احمدی ان دکنی آمیز جملوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ دکن میں تذکرے کی روایت ابتدائی طور پر ملفوظات کی شکل میں نمو پاتی رہی اور یہ ملفوظات فارسی تحریروں کے درمیان رواں لکھے گئے۔ مراۃ احمدی مکمل طور پر ملفوظات اور تذکرے کی نمائندہ کتاب تو نہیں لیکن پیر طریقت کے استعمال کردہ جملے یہ ثابت کرتے ہیں کہ اس دور میں تذکرے کی ابتدائی تشکیل کے لیے ملفوظات نے ساز گار ماحول پیدا کر دیا تھا۔ چنانچہ تذکرے کی روایت اور اس کی ایک ابتدائی نوعیت ملفوظات کی نمائندگی شاہ منجھن کی کتاب مراۃ احمدی میں ملتی ہے۔

تحفۃ الکرام:

دکنی دور کی یادگار کتابوں میں اس کتاب کا بھی شمار کیا جاتا ہے۔ فارسی میں رقم کردہ اس کتاب میں دکنی ملفوظات کی جھلک محسوس کی جا سکتی ہے۔ میر علی شیر

---

[۱] خاتمہ مراۃ احمدی ص۔

[۲] " " مطبوعہ کلکتہ ص ۱۲۱

قانع کی یہ کتاب چند ایسے فقرات کی نمائندگی کرتی ہے جن میں ملفوظات کی جھلک نمایاں ہیں۔ ذیل میں تحفۃ الکرام کے چند جملے جن سے ملفوظات کی روایت کو تقویت ملتی ہے بطور مثال درج کیے جا رہے ہیں۔

۱۔ بھائی محمود خوش ہو، اساں تھیں۔ وڈا تسا تھیں۔ وڈا سانڈے گھر جلال جہانیاں آیا"۔ [۱]

۲۔ "جو راجن جی کا اونہ بھایا ہو دے تو تجھ جیسے فقیروں کی برسوں تیں کنا سی کرے۔" [۲]

۳۔ "ارے میاں الولک بولتے کیوں نہیں"۔ [۳]

ان جملوں میں دکنی کی روایت واضح ہوتی ہے اور یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تذکرہ کا فن شروع ہونے سے قبل دکنی زبان میں ملفوظات کی روایت فروغ پا رہی تھی تحفۃ الکرام میں مستعملہ یہ جملے ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ دکن میں قطب شاہی دور کے ساتھ ہی فارسی تحریروں کے درمیان دکنی الفاظ اور جملوں کو ملفوظات کے طور پر استعمال کرنے کا رواج عام ہوا۔

جمعات شاہیہ:

انجمن ترقی اردو پاکستان۔ کراچی کے کتب خانے میں محفوظ یہ کتاب قدیم دور میں تذکرہ کی روایت کی نمائندگی کرتی ہے۔ یہ کتاب فارسی میں لکھی گئی ہے۔ لیکن ملفوظات کی خصوصیت اس کتاب میں بھی موجود ہے۔ ذیل میں جمعات شاہیہ کی تحریر کے چند ایسے

---

[۱] تحفۃ الکرام۔ جلد اول ص ۱۸

[۲] " " ص ۳۱

[۳] " " ص ۸۱

جملے درج کیے جارہے ہیں جن میں تذکرہ کی قدیم روایت یعنی ملفوظات کی جھلکیاں ملتی ہیں

۱۔ "روز در حجرہ مشغول ۔ حضرت قطبیہ در آمدم ۔ دیدم کہ اضطراب عظیم
می گردند و بہ دستِ دیوار گرفتہ درونِ حجرہ می کردند و ہندیہ" مجھ پر میں
کھیڑیا سائیں پرم چمکاسے" برزبان مبارک جاری فرمودند" ۱؎

۲۔ "آئیں کہ کر جوری کماسے ۔ جوری کا کری میٹھا لاگے" ۲؎

۳۔ تساں راج اساں فوجے یعنی تو بادشاہ دمن وزیر ۔ ۳؎

۴۔ کاکا فیروز چنگا ہے ۔ کاکا چنگا شد یعنی نیک شد" ۴؎

۵۔ "پیر ہوا مرید جوگی ہوا" ۵؎

ان جملوں میں فارسی کے دوران دکنی الفاظ کا استعمال یہ ثابت کرتا ہے کہ جمعات شاہیہ ایک فارسی کتاب ہونے کے باوجود نثر کے دوران اس میں دکنی الفاظ بطور ملفوظات استعمال کیے گئے ہیں جن سے دکنی دور میں فارسی روایت کے ساتھ ساتھ زبان دکنی کے رواج کا پتہ چلتا ہے ۔ اور اس حقیقت سے بھی آشنا ہوتی ہے کہ دکنی دور درحقیقت ایک ایسا ادبی دور تھا جبکہ کئی زبانیں ایک دوسرے سے مل کر دکن کے علاقہ میں ملفوظات کے طور پر نشو ونما پا رہی تھیں ۔ جمعات شاہیہ اسی قبیل کی ایک کتاب ہے جس میں تذکرے کی قدیم شکل ملفوظات کی نمائندگی ملتی ہے ۔

۱؎ جمعات شاہیہ (قلمی) ورق ۶۳ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ۔

۲؎ " " " ۶۱

۳؎ " " " ۱۰۰ " "

۴؎ " "

۵؎ " جلد پنجم بحوالہ نوائے ادب جلد ۵ ۔ اکتوبر ۱۹۵۲ء ص ۳۳

مرآۃ سکندری

قطب شاہی دور میں دکنی ادب کی روایت کے فروغ میں تذکرے کا فن ابتدائی طور پر ملفوظات کی شکل میں ترقی پاتا رہا۔ یہ ملفوظات فارسی کتابوں کے درمیان مستعملہ ایسے جملوں کی شکل میں ہیں جو دکنی زبان میں لکھے گئے۔ اس قسم کی کتابوں میں مرآۃ سکندری کا بھی شمار ہوتا ہے جس میں فارسی تحریر کے درمیان بیشتر دکنی جملے بطور ملفوظات استعمال ہوئے ہیں۔ مرآۃ سکندری پہلی بار مطبع فتح الکریم بمبئی سے ۱۳۰۸ھ میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کا عہد سلطان قطب الدین سے منسوب ہے۔ اس کتاب کے چند جملے بطور ملفوظات استعمال ہوئے ہیں درج کیے جاتے ہیں۔

۱۔ "پڈہ ڈو کرے یعنی بخواں اے پیرک۔" [۱]

۲۔ " پیری سب کوئی جوڑے۔" [۲]

اس فارسی آمیز تحریر کے دوران دکنی عبارت سے ثبوت ملتا ہے کہ ابتدائی طور پر دکنی زبان کی روایت فارسی تحریروں میں دکنی جملوں کے استعمال سے فروغ پانے لگی اور یہی انداز ابتدائی طور پر تذکرہ کی بنیاد قرار پایا۔ مرآۃ سکندری دکنی عہد کے قطب شاہی دور کی ایک ایسی یادگار ہے جس کے ذریعہ تذکرہ کی روایت دکن میں ملفوظات کی صورت میں ظاہر ہونے کا پتہ دیتی ہے۔ مرآۃ سکندری میں مستعملہ دکنی جملے اس دور کی زبان کے یادگار ہیں جو نہ صرف دستاویزی حیثیت رکھتے ہیں بلکہ ادبی اعتبار سے بھی ان کا مرتبہ کافی بلند ہے۔

---

[۱] مرآۃ سکندری ص ۶۵ بار اول مطبع فتح الکریم بمبئی ۱۳۰۸ھ

[۲] ایضاً ص ۱۱۱ " " "

بحر الحقائق

دکنی میں تذکرے کی روایت کو ملفوظات کی شکل میں پیش کرنے والے ادیبوں میں شاہ وجیہہ الدین علوی گجراتی کا شمار ہوتا ہے جنہوں نے اپنی کتاب "بحر الحقائق میں مذہبی سوالات کے جوابات دکنی میں دیئے ہیں"۔ ان کے مریدوں نے "بحر الحقائق" کے نام سے ایک مجموعہ مرتب کیا تھا جس میں سوال فارسی میں ہیں اور جواب جو شاہ وجیہہ الدین نے دیئے ہیں اردو میں ہیں؛ جن سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت شاہ وجیہہ الدین علوی گجراتی دکنی عہد میں ملفوظات کی نمائندگی کرنے والے ایک منفرد ادیب ہیں ان کا عہد ۱۵۰۴ء سے ۱۵۸۹ء تسلیم کیا گیا ہے۔ درس و تدریس ان کا پیشہ تھا "بحر الحقائق" میں پیش کردہ جملوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس عہد میں ملفوظات ترقی پا رہے تھے۔ جنوبی ہند میں قطب شاہی دور کے توسط سے دکن میں ایک نئی زبان نہ صرف پروان چڑھ رہی تھی بلکہ اس زبان میں تذکرہ کی ابتدائی روایت یعنی ملفوظات بھی تحریر کیے جا رہے تھے۔ "بحر الحقائق" میں مستعملہ چند جملے یہاں درج کیے جا رہے ہیں۔

۱۔ "انہوں کو کیا کشف ہوئے نہ ہوئے کام اس کا ہے"۔

۲۔ "کیا ہوا جو بھوکوں موا" بھوکوں موئے تئیں کیا خدا کوں اپڑ یا۔ خدا کو اپڑنے کی استعداد ہور ....

۳۔ "جیسی تجلّی پکڑے تیسا ارادہ دیوے" اگر عبد کی تجلّی پکڑے عبدیت ارادہ دیوے۔"

۴۔ عارف اُسے کھویں جو خدا سے بھر یا ہوئے۔

۵۔ اگر کسی کوں تھوڑی سی صفا ہوئے جو حرام لقمہ کھاوے یا حرام فعل کرے تو تیخ پاوے۔ دوجے بار بھی پاوے تیجے بار بھی

پادرے " لہ

ان جملوں سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت وجیہہ الدین گجراتی دکن کے پہلے ملفوظ نگار ہیں جن کے ملفوظات کو مریدین نے محفوظ کیا۔ یہ نہ صرف دکنی کے پہلے ملفوظات کا درجہ رکھتی ہے بلکہ ایک اعتبار سے اُسے اُردو کی پہلی ملفوظات کی کتاب کا درجہ بھی دیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ اس کتاب میں سوالات فارسی میں لکھے گئے ہیں لیکن ملفوظات کی خصوصیت میں یہ اصول کارفرما ہوتا ہے کہ کسی بھی مرشد یا صاحب شخصیت عالم کے وعظ یا زرّین اقوال کو اس کے مریدین یا قربت رکھنے والے ضبط تحریر میں لائیں چونکہ "بحر الحقائق" کو حضرت وجیہہ الدین کے مریدین نے ترتیب دیا۔ اسی لیے یہ مکمل ملفوظات کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کتاب کے ذریعہ دکنی کو یہ مرتبہ حاصل ہوتا ہے کہ اردو میں سب سے پہلے اسی زبان نے ملفوظات کی روایت کو فروغ دیا۔

حضرت وجیہہ الدین علوی گجراتی کے بیشتر مریدین اس عہد میں گجرات کے علاقہ میں مذہبی خدمات انجام دے رہے تھے۔ مختلف مریدین نے ان کے مختلف ملفوظات کا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح ایک اور مخطوطہ میں شاہ وجیہہ الدین علوی کے بہت سے اردو فقرے ملتے ہیں جو فارسی عبارت کے درمیان استعمال میں آئے۔ ان میں سے چند یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

۱۔ رات دن خدا جنوں کی مدح کرے۔

۲۔ نہ نہ۔ یوں تو ذوق نہ ہووے

لہ بحر الحقائق" مملوکہ افسر صدیقی امروہی۔ بتوسط تاریخ ادب اُردو۔ از ڈاکٹر جمیل جالبی مطبوعہ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤز دہلی۔ جنوری ۱۹۷۷ء صـ ۱۰۰

۳۔ انہوں کوں کیا فائدہ
۴۔ آپیں جھکر (جھک) مار کر قبول کرے گا۔
۵۔ جب ترقی پکڑیں گے۔ آپیں درس کہیں گے
۶۔ آقا شیخ عربی کا تقوی کہاں میرا امکان کہاں۔
۷۔ سب چھوڑ بیٹھے تو شاب فائدہ ہو جاوے
۸۔ یک ہوں یا دو ہوں
۹۔ ایک گھری، دو گھری یا چار گھری
۱۰۔ تمہی ایہاں رہتے ہو۔
۱۱۔ ولیوں کہاں صفتاں ہوتیاں
۱۲۔ فقیر پر فرض تو نہیں۔[1]

شاہ وجیہہ الدین علوی گجراتی کے ملفوظات میں شائستگی نرمی اور گھلاوٹ کا احساس ہوتا ہے۔ "شاہ وجیہہ الدین علوی کی زبان" دکن اور گجرات کی زبان کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے اور یہی ان کے ملفوظات کی تاریخی اہمیت ہے۔"[2]

دکن کے ملفوظات میں قطب شاہی عہد سے وابستہ ادیبوں نے فارسی تحریروں کے درمیان دکنی شمالی اور گجراتی الفاظ اور جملے استعمال کر کے مذہبی طور پر اردو میں تذکرہ کی بنیاد رکھی۔ ان ملفوظات کی علمی طور پر کوئی حیثیت نہیں لیکن ان کا مطالعہ اس حیثیت سے اہمیت رکھتا ہے کہ یہی ملفوظات تذکرہ کو فروغ دینے کا باعث ہوتے ہیں اور ان سے قدیم دکنی کی روایت کے آغاز کا پتہ چلتا ہے۔

---

[1] علمی نقوش از ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں ص ۹۵ - ۱۰۴ مطبوعہ اعلیٰ کتب خانہ ناظم آباد کراچی ۱۹۵۷ء

[2] تاریخ ادب اردو جلد اول از ڈاکٹر جمیل جالبی ص ۱۰۱ ایجوکیشنل بک ہاؤس دہلی جنوری ۱۹۷۷ء

ملفوظاتِ حضرت سید محمد جونپوری :

سید محمد جونپوری کے ملفوظات اور دوہرے تذکروں میں محفوظ ہیں ۱۵۰۴ء میں ان کا تبلیغی مشن کا ایک کارنامہ وجود میں آتا ہے جسے ملفوظات حضرت جونپوری کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اگرچہ ان کا تعلق گجرات سے رہا لیکن ان کے ملفوظات کو دکنی دور میں اس لیے شمار کیا جاتا ہے کہ قدیم دور میں گجرات دکن کا ایک حصّہ تھا۔ ان کے ملفوظات کے چند جملے درج ہیں۔[1]

۱۔ اچھے جی اچھے

۲۔ شہ کی چوٹ شکر کی لوٹ۔

۳۔ بھیا بسر جو کی جو کی[1]

ان جملوں سے پتہ چلتا ہے کہ سید محمد مہدی کی تحریروں میں بھی دکنی اور ملفوظات کا اثر غالب ہے۔ قدیم دور میں سید محمد مہدی اور ان کے پیروں کی علمی زبان تو فارسی تھی لیکن ان کی روزمرہ کی زبان دکنی تھی جس میں وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ مہدوی بزرگوں کے اقوال اور فقرے آج بھی تاریخ اور تذکروں میں محفوظ ہیں۔ تاریخ غوبیک کے مصنف نے ہندوی کے ذریعہ اظہار بنانے کا یہی جواز دیا ہے کہ سبھی ہندی میں اپنے مفہوم اور مطلب کو بیان کرتے ہیں۔ قرآن کا مطلب بھی اسی زبان میں بیان کیا جاتا ہے۔ مہدی موعود نے بھی ہندی میں اپنے خیالات ارشاد فرمائے ہیں[2]

قطب شاہی عہد میں اردو نثر ابتدائی مدارج میں تھی۔ شاعری کا ارتقاد

---

[1] ملفوظاتِ حضرت سید محمد جونپوری۔ مخطوطہ انجمن ترقی اُردو پاکستان کراچی۔

[2] تاریخ ادب اردو جلد اول از۔ ڈاکٹر جمیل جالبی۔ صفحہ ۱۳۳ بحوالہ بحرالنکات قلمی و بحوالہ مقالات شیرانی جلد دوم صفحہ ۲۰

عمل میں آرہا تھا۔ چنانچہ اُردو نثر کا فروغ گمنام سا رہا۔ چند نثر نگاروں نے علمی و ادبی نمونے پیش کرنے کی کوشش کی جن میں میراں جی حسین خدا نما اور ان کی کتاب شرح تمہید ہمدانی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس کا شمار ایک رسالہ کی حیثیت سے کیا جاتا ہے۔ مولانا عبداللہ نے اسی دکنی دور میں احکام الصلوٰۃ لکھی۔ وجہی کی سب رس، میراں یعقوب کی شمائل الاتقیا" عابد شاہ کی گلزار السالکین اور کنز المومنین بھی قطب شاہی عہد کے نثری کارنامے سمجھے جاتے ہیں۔ اسی طرح سلطان نے ایک کتاب دارالاسرار تحریر کی۔ یہ تمام کتابیں اگرچہ قطب شاہی نثر کی نمائندہ ہیں لیکن ان میں تذکرہ یا اس کی کسی شاخ کا دخل دکھائی نہیں دیتا۔ اسی لیے انہیں تذکرے یا ملفوظات میں شامل نہیں کیا جاتا۔ البتہ اس دور میں گجراتی علماء اور صوفیا کی وہ فارسی کتابیں جن میں تحریر کے دوران دکنی فقرے استعمال ہوئے ہیں۔ انہیں تذکرے کی شکل ملفوظات میں شمار کیا جاتا ہے جن میں شاہ عالم عرف شاہ منجھن کی کتاب مراۃ احمدی، میر علی شیر قانع کی کتاب تحفۃ الکرام اس کے علاوہ جمعات شاہیہ، مراۃ سکندری، شاہ وجیہہ الدین علوی گجراتی کی بحر الحقائق اور سید محمد جونپوری کے ملفوظات کو دکنی میں ابتدائی طور پر تذکرے کی روایت کو فروغ دینے والی تحریریں تصور کیا جاتا ہے۔ قطب شاہی دور میں یہ نثری کتابیں تذکرہ اور اس کی ابتدائی شکل ملفوظات کو فروغ دینے کا سبب ثابت ہوئیں۔ دکن میں قطب شاہی دور کے ساتھ ہی ایک اور سلطنت بیجاپور میں قائم تھی جسے عادل شاہی سلطنت کا نام دیا جاتا ہے۔ اس سلطنت نے بھی دکنی کے فروغ میں حصہ لیا۔

عادل شاہی عہد:

دکن میں قائم شدہ پانچ سلطنتوں نے بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد ایک نئی زبان میں ادبی روایت کو فروغ دینے میں نمایاں طور پر حصہ لیا۔ ان پانچ سلطنتوں

میں دوسری بڑی سلطنت عادل شاہیہ تھی جو ۱۴۹۰ء سے ۱۶۸۵ء تک قائم رہی۔ اس دور میں دکنی کو فروغ دینے کے لیے پوری کوششیں کی گئیں ساتھ ہی شعر و ادب سے دلچسپی کا رجحان بھی عام ہونے لگا۔ عادل شاہی دور اس وجہ سے بھی دکنی دور میں اہمیت رکھتا ہے کہ اس سلطنت سے وابستہ بادشاہوں نے شاعروں اور ادیبوں کی سرپرستی کی اور دکن میں ادبی دبستان کی بنیاد رکھی۔ ۱۴۹۰ء میں شروع ہونے والا عادل شاہی دور ابتدائی طور پر شعر و شاعری سے وابستہ رہا۔ پھر رفتہ رفتہ دکنی نثر کے نمونے عالم وجود میں آنے لگے۔ اس دور کی نثر دکنی طرز و انداز کی رہی۔ لیکن ادبی طور پر اس نثر میں کوئی خصوصیت واضح نہ ہو سکی۔ عادل شاہی دور کی نثر میں مذہبی عکس اس قدر نمایاں ہے کہ اسے ادبی تحریر کی خصوصیت نہیں دی جا سکتی اس دور میں دکنی ادب کی روایت پروان چڑھتی رہی۔ لیکن ادبی طور پر تذکرہ یا اس قبیل کی کوئی فنی کتاب عالم وجود میں نہ آسکی۔ فارسی تحریروں کے درمیان دکنی نمونے پیش کرنے کا سلسلہ اس عہد میں منقطع ہو گیا۔ لیکن اُردو کو درباری حیثیت حاصل ہو گئی اور دکنی زبان مکمل طور پر دفتری کاروبار کے لیے استعمال کرنے کا سب سے پہلا اقدام اسی سلطنت کے زیر اثر پروان چڑھا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

"جب ابراہیم عادل شاہ ثانی المعروف بہ جگت گرو تخت نشین ہوا تو اس نے دفتروں میں اُردو کو دوبارہ رائج کیا اور اس کے بعد عادل شاہی حکومت کے زوال تک اُردو زبان ہی حکومت کے دفتروں کی زبان رہی۔ جگت گرو کی کلیات نورس اور علی عادل شاہ ثانی کی کلیات اس بات کی گواہ ہیں کہ ان لوگوں کا فارسی زبان سے خاندانی رشتہ تقریباً منقطع ہو گیا تھا اور اردو زبان ہی ان کی زبان ہو گئی تھی۔" [1]

---

[1] تاریخ ادب اُردو جلد اول از: ڈاکٹر جمیل جالبی ص ۱۸۵ مطبوعہ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس جنوری ۱۹۷۷ء

اس دور میں دکنی الفاظ تخصیص کے ساتھ رواج پا گئے۔ لازمی ہے کہ جب سرکاری زبان ہی دکنی قرار دی جائے تو ملفوظات یا دیگر تذکرہ کی روایت فارسی کی بجائے اردو میں منتقل کر دی جائے۔ یہی عمل عادل شاہی دور میں دکنی کے ساتھ ہوا۔ اس دور میں تحریر یا بیان کے سرچشمے صرف شاعری سے منسلک رہے۔ بیجاپور کے اندازِ فکر کی نمائندگی کرتے ہوئے عادل شاہی سلطنت کی علم و ادب سے دوستی کو ڈاکٹر جمیل جالبی اس طرح واضح کرتے ہیں :-

"بیجاپور کے تصوّف نے اپنے ہندوی پن سے جو صورت بنائی وہ میرانجی، جانم اور امین الدین اعلیٰ سے ہوتی ہوی سارے معاشرے میں تصوف کی مقبول صورت بن گئی۔ اس پر بھی وہی مزاج غالب ہے جو بیجاپوری اسلوب کی انفرادیت ہے۔ عادلشاہی دور کی تخلیقی سرگرمیوں میں فن تعمیر خطاطی اور شعر و ادب کو خاص اہمیت حاصل تھی ادب میں تاریخی اور مذہبی موضوعات بھی شامل تھے۔ لیکن سب سے زیادہ اہمیت شاعری کو حاصل تھی۔" [۱]

اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ عادل شاہی عہد میں نثر سے زیادہ شاعری کو ترقی ہوی۔ تاریخ کی کتابوں میں تذکرہ کی روایت واضح نہیں ہوتی اور نثر میں تحریر کردہ اس دور کی تمام کتابیں تصوف اور اسلام سے متعلق ہیں۔ جن میں برہان الدین جانم کی کلمۃ الحقائق اور رسالہ وجودیہ کافی مشہور ہیں۔ ان مذہبی تحریروں میں تذکرہ یا ملفوظات کی روایات نہ ہونے کے برابر ہے۔ عادل شاہی دور میں تذکرہ کی کسی بھی

حکایت کو فروغ حاصل نہیں ہوا۔ اس دور کے ملفوظات بھی دستیاب نہیں ہوئے اس دور کے ملفوظات بھی دستیاب نہیں ہوئے البتہ شاعری عادل شاہی دور میں کافی عروج پر رہی۔ اگرچہ عادل شاہی دور سے پہلے اردو ملفوظات دستیاب ہوتے ہیں لیکن دور عادل شاہی کے ملفوظات اور تذکرے کا نایاب ہونا یہ ثابت کرتا ہے کہ اس دور میں بھی ملفوظات لکھے گئے ہوں گے جو زمانے کی خرد برد کی نذر ہو گئے۔ اسی لیے مخطوطات کی شکل میں بھی ان کا ملنا دشوار ہے۔ بیجاپور کی درگاہوں کے متولیوں اور سجادگان کے خصوصی ذخیرہ میں کئی قلمی نسخے موجود ہیں لیکن وہ انہیں بطور تبرک محفوظ رکھے ہیں یہاں تک کہ کسی کو اس کے مطالعہ کی اجازت بھی نہیں دیتے۔ اگر یہ ذخیرے دستیاب ہو جائیں تو امکان ہے کہ مستقبل کے نقاد کے ہاتھ میں کچھ ایسی نایاب دستاویزیں آجائیں گی کہ جن کی وجہ سے دکن میں تذکرہ کے آغاز و عہد کو تقویت ملے گی۔

نظام شاہی دور:

دکن میں اردو یا دکنی کے فروغ کے لیے جن درباروں نے حصہ لیا ان میں نظام شاہی عہد بھی کافی اہمیت رکھتا ہے۔ دکن میں بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد یہ تیسری سلطنت تھی جو دکن کے علاقہ احمد نگر پر قائم ہوئی۔ احمد نگر کی سلطنت نے ۸۹۵ھ میں قیام کے بعد ۱۰۴۳ھ تک حکومت کی اس دور میں اردو یا دکنی کی روایت اور اس کی ادبی تشکیل کا سلسلہ جاری رہا۔ لیکن تاریخی شواہد اور ادبی مخطوطے نایاب ہیں۔ کل دس بادشاہوں نے احمد نگر پر نظام شاہی سلطنت کا سکہ چلایا۔ ان کا عہد حکومت بھی کافی طویل رہا۔ اس دور کے نثری نمونے نایاب ہیں۔ البتہ شاعری کی چند کتابیں مخطوطات کی شکل میں دستیاب ہوئی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ نظام شاہی دور میں بھی دکنی زبان اپنے ابتدائی مدارج طے کر رہی تھی۔

نظام شاہی عہد میں دکنی تذکروں کی تفصیل دستیاب نہیں تاہم چند ایسے شواہد ضرور ملتے ہیں کہ جن کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ نظام شاہی عہد میں بھی تذکرے لکھے گئے۔ رسالہ تذکرات میں نظام شاہی عہد کے تذکرے کا ذکر کچھ اس انداز میں کیا گیا ہے۔

مجموعۂ دواوین دکھنی وہندی:

یعنی تذکرۂ نظام شاہی قدیم نظام الملک صوبہ دار دکن کے بزرگوں میں سے کسی نے تالیف کیا تھا۔ انھوں نے اپنے زمانے تک کے کل دیوان شعرائے متقدمین ریختہ گو جو بنگالہ و ہندوستان میں گزرے تھے جمع کر کے ان کا کلام انتخاب کیا ان نواب صاحب نے ۱۱۶۱ھ میں انتقال کیا۔" [1]

یہ تذکرہ محققین کو ابھی تک دستیاب نہ ہو سکا۔ لیکن گارساں دتاسی نے اپنے خطبات میں اس کا لطور خاص ذکر کیا ہے۔ اس تذکرہ کے متن اور تفصیلات سے بھی واقفیت نہ ہو سکی لیکن اس بات کا ضرور پتہ چلتا ہے کہ نظام شاہی دور میں لکھا گیا یہ تذکرہ دکنی اور ہندی شاعروں کی زندگی کے حالات کے ساتھ ساتھ انتخاب کلام کا ایک بہترین نمونہ تھا۔ اس تذکرہ کی تالیف کی خصوصیت جیسے کہ متن میں بیان کی گئی ہے۔ اس قدر ہے کہ صاحب دیوان شعرا کو ہی اس تذکرہ میں زیر بحث لایا گیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس تذکرہ میں معیاری اساتذہ کا کلام منتخب کیا گیا ہوگا۔ نظام شاہی عہد کے تذکروں کی بازیافت نہ ہو سکی لیکن قدیم کتابوں میں لطور سند استعمال کیے جانے والے ناموں میں مزید کئی تذکروں کا ذکر گارساں دتاسی نے اپنے تذکرے میں کیا ہے۔

نظام شاہی عہد میں دکنی نثر پروان چڑھ چکی تھی۔ احمد وہ تذکرہ کی

---

[1] حاشیہ: رسالہ تذکرات: از گارساں دتاسی۔ ترجمہ منشی ذکا اللہ دہلوی مرتبہ ڈاکٹر عتیق دیبا احمد علوی ص ۱۹ مطبوعہ ۱۹۹۶ء

شکل میں صنفِ ادب کا حق ادا کر رہی تھی۔ زمانے کی خرد برد نے نظام شاہی اردو اس عہد کے تذکروں کو نیست و نابود کر دیا۔ لیکن اس کے آثار قدیم کتابوں میں موجود ہیں۔ دکنی کے محققین سے توقع ہے کہ وہ ایسے تذکروں کی بازیافت کے لیے تحقیقی کوششیں جاری رکھیں گے

بریدشاہی دور:

۱۴۸۲ء میں بہمنی سلطنت کا شیرازہ بکھرنے کے بعد بیدر میں قائم ہونے والی بریدشاہی سلطنت کے زیر اثر بھی دکنی زبان و ادب کا ارتقا ہوا۔ اس دور کے ادبیات کا سراغ نہ مل سکا۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بہمنی سلطنت کے بعد دکن میں قائم ہونے والی تمام سلطنتوں نے ایک نومولود زبان کی ترقی میں حصہ لیا۔ بیدر کو علم و ادب کا گہوارہ بنانے میں بریدشاہی سلطنت کا خاص حصہ رہا ہے امیر قاسم نے اس سلطنت کی بنیاد رکھی۔ یہ وہ دور تھا جبکہ دکن میں ایک نئی زبان کا شہرہ ہو گیا تھا۔ ادیب و شاعر اس نئی زبان کو تخلیق کا ذریعہ بنانے میں خود کی عزت افزائی سمجھتے تھے کیونکہ دکنی زبان میں ابتدائی طور پر شاعری کا چرچا رہا اسی لیے دکن کے قدیم دور میں نثر پاروں کی چھان بین کافی کٹھن مسئلہ ہے۔ اگرچہ چودھویں صدی سے دکنی میں تخلیق کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا لیکن نثری ادب کی نشو و نما کی رفتار کافی سست رہی۔ قدیم مخطوطات میں شعری نمونے تو حاصل ہو جاتے ہیں لیکن نثری کارناموں کا پتہ نہیں چلتا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ بھی رہی کہ دکن کے کارناموں کو محفوظ کرنے کا شعور انیسویں صدی کے بعد پیدا ہوا جبکہ دکنی ادب کا بیشتر ذخیرہ تباہ و برباد ہو چکا تھا۔ بریدشاہی دور کے کارنامے بھی اسی تباہی کی نذر ہو گئے۔

دکن میں سب سے پہلے دکنی زبان و ادب کی ترویج کی شمع بہمنی سلطنت کے بادشاہوں نے جلائی اور اس سلطنت کے اختتام کے بعد دکن میں قائم بقیہ ۵ سلطنتوں نے

اس شمع کو روشن رکھنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ جن میں برید شاہی کا شمار بھی ہوتا ہے بیدر اور اس کے اطراف و اکناف کے کتبوں کے مطالعہ اور اس دور کی فارسی کتابوں کی چھان بین سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس سلطنت کے زیر اثر فارسی کے درمیان دکنی جملوں کے استعمال کو روا رکھا گیا تھا۔ نظام شاہی دور کی طرح برید شاہی دور کے کارناموں پر ابھی تک روشنی نہ پڑ سکی شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ قدیم مورخین نے ان دو سلطنتوں کی ادبی خدمات کی جانب توجہ نہیں دی۔ اس عہد میں کئی تاریخی، مذہبی اور عقائد سے متعلق کتابیں لکھی گئیں جن میں بیشتر کا تعلق فارسی زبان سے ہے۔ نصیر الدین ہاشمی نے اپنی کتاب "دکن میں اردو" کے ذریعہ اس دور کے صرف ایک دکنی شاعر قریشی متوفی سنہ ۱۰۲۲ھ کا ذکر کیا ہے۔ اس عہد کے دکنی نثر نگاروں کا کوئی ٹھوس ثبوت اور تخلیق کا کوئی حوالہ نہ مل سکا۔ دور قدیم میں کتابیں محفوظ رکھنے کا کوئی جامع طریقہ کار نہ ہونے کی وجہ سے بیشتر ذخیرہ تلف یا ضائع ہو گیا جن میں برید شاہی دور کے کارنامے بھی اہمیت رکھتے ہیں۔

عالمگیری دور:

دکن میں مغلوں کی آمد نے نہ صرف یہاں کی سلطنتوں کو تہس نہس کر دیا بلکہ مغلوں کے حملوں کا اثر دکنی پر کافی گہرا پڑا۔ اگرچہ جہانگیر کے دور ہی سے بلکہ اکبر کے زمانے میں مغلوں نے دکن کی جانب نگاہ کی لیکن دکن کے علاقہ پر سب سے زیادہ اثر انداز ہونے والا شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر ہے۔ ایام شہزادگی کے دوران ہی وہ دکن میں متعین تھا۔ چنانچہ سب سے پہلی بار وہ سنہ ۱۶۳۶ء میں نائب صوبہ دار بن کر آیا جبکہ اس نے سنہ ۱۶۵۸ء میں شہنشاہیت سنبھالی اس طرح سنہ ۱۷۰۷ء میں اس کا انتقال ہوا چونکہ اورنگ زیب کے عہد یعنی سنہ ۱۶۳۶ء تا سنہ ۱۷۰۷ء تک دکن کی جانب اس کی نگاہیں مرکوز رہیں۔ اسی لیے اس

عہد کو عالمگیری دور کہا جا سکتا ہے۔ اس کے دور میں نہ صرف دکن علم و ادب کا گہوارا بن گیا بلکہ دور دراز کے ملکوں سے عالم اور فاضل اشخاص دکن میں جمع ہونے لگے۔ اس دور میں اورنگ آباد علاقہ، دکن کا مرکز قرار پایا جہاں شاعروں اور ادیبوں کی کثیر تعداد جمع ہو گئی اور یہی وہ دور ہے جہاں سے دکنی زبانوں میں "کامل تذکرے" لکھنے کی روایت کا آغاز ہوتا ہے۔ اسی عہد میں اردو کے ابتدائی تذکرے لکھے گئے۔ فارسی میں لاتعداد تذکرے موجود ہیں۔ موضوع کے اعتبار سے یہاں پر دکنی تذکروں سے بحث کی جائے گی۔

شہنشاہ عالمگیر کے دور میں فارسی کا رواج تھا۔ دکنی کی سلطنتوں پر قبضہ کی وجہ سے وہ حکومتیں جو دکنی کی ترقی کا بیڑا اٹھائے ہوئے تھیں تباہ ہو گئیں۔ اس طرح دکنی ادب کی سرپرستی ختم ہو گئی۔ دکن کے بیشتر شاعر اور ادیب اورنگ آباد میں جمع ہو گئے۔ مغلیہ تسلط سے دکنی کا شیرازہ بکھر گیا۔ اس دور میں مقیمی، عاجز، ضعیفی، ذوقی، بحری، عشرتی، ہنر، ذکی، وجدی، آزاد، صنعتی، ولی بیجاپوری جیسے شاعر گزرے ہیں جبکہ اورنگ آباد میں ولی اورنگ آبادی داؤد اورنگ آبادی، سراج اورنگ آبادی اور دیگر شعرا گذرے ہیں۔ اس دور میں بھی شاعری کا شور رہا۔ چند نثر نگاروں نے کچھ کارنامے انجام دیئے بھی تو اس قدر کہ مذہبی کتابوں کی تشریحات کو روا رکھا۔ اس عہد میں دکنی عام بول چال کی زبان بن چکی تھی۔ البتہ اس دور کے نثری کارناموں کی بازیافت نہ ہو سکی۔

عالمگیری دور کو اس اعتبار سے اہمیت دی جا سکتی ہے کہ اس عہد میں دکنی علاقوں میں "مکمل تذکرہ" لکھنے کے لیے سازگار ماحول پیدا ہوا اور دکنی نثر کا ایک مزاج بننے لگا۔ دکن کے نثر نگاروں نے فارسی تذکرہ لکھنے کی بنیاد رکھی جس کی وجہ سے دکنی میں تذکرے لکھنے کی ترغیب مل سکی۔ اس عہد کو دکنی تذکروں کا فنی مزاج بنانے کا دور کہا جا سکتا ہے۔ اورنگ زیب عالمگیر کی وجہ سے دکن اور دہلی کا ارتباط ہوا۔ دکنی اور دہلی

کی زبان کے الفاظ ایک دوسرے سے ٹکرائے۔ دکنی مزاج دہلی کی آمیزش کا آغاز ہوا۔ یہی دور ہے جب کہ دکنی نے اپنا چولا بدلا اور اس نے دکنی کے مرہٹی، کنٹری تلگو اور گجراتی الفاظ کی تراش و خراش کر کے انہیں ادبی بنانے پر زور دیا۔ اس طرح ایک بات لچر سی زبانِ دکنی کو نیا آہنگ ملنے لگا۔ اسی عہد کی اثر اندازی کی وجہ سے بعد میں دکنی میں جتنے تذکرے لکھے گئے وہ تمام نئے لب و لہجے کے علمبردار رہ گئے۔ اگر دکن پر عالمگیری دور نہ آتا تو اس کے تمام ادبیات میں دکنی اثر غالب رہتا۔ اورنگ زیب عالمگیر کی وجہ سے دکن اور دہلی کی بولیوں کا اختلاط ہوا اور دونوں بولیوں کے سنگم سے ایک نئی زبان سے ایک نئی زبان سے سر اٹھایا جس میں دہلی کے الفاظ بھی شامل تھے اور دکنی کا لب و لہجہ بھی لیکن دکنی لب و لہجہ کسی قدر صاف ہونے لگا تھا کیونکہ دہلی الفاظ کی نفاست نے دکنی الفاظ کے کھردرے پن کو یکسر نظر انداز کر دیا تھا۔ اسی عہد میں زبان دکنی کا خاتمہ ہوتا ہے اور دکن کے تمام نظم و نثر پر دہلی کا اثر غالب ہو جاتا ہے اس طرح دکنی لب و لہجہ اس دور میں آکر دم توڑ دیتا ہے۔ اس کے بعد جتنی بھی کتابیں دکن میں لکھی گئیں ان میں دہلوی الفاظ اور انداز کا پرتو شامل ہونے لگا۔ اس طرح دہلوی لہجہ فاتح ہو گیا اور دکنی لہجہ مفتوح قرار دیا جا کر قعرِ گمنامی میں چلا گیا۔

عالمگیری عہد سے دکنی روایات مسمار ہو گئیں۔ دکنی ادب ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر گیا۔ دکنی پر فارسی آمیزی کا لبادہ اثر انداز ہونے لگا۔ دکنی شاعروں اور ادیبوں دہلویت کو قبول کرنا شروع کر دیا جس کے نتیجہ میں دکنی طرز و انداز رفتہ رفتہ مٹنے لگے اس طرح ۱۸۰۰ء تک تمام دکنی ادبیات پر دہلویت کا رنگ چڑھ گیا۔ اور دکنی ادیبوں نے ایسی دکنی کو اپنا انداز تحریر بنا لیا جو دکنی سے دور اور دہلی کے لب و لہجہ سے قریب ہو گئی۔

دکنی تذکروں میں عالمگیری عہد کو اس وجہ سے اہمیت حاصل ہے کہ اس کی وجہ سے دکنی زبان میں تغیر پیدا ہوا اور اب دکن مکمل طور پر دہلی کا پرتو نظر

لگا۔ عالمگیر کے عہد میں دکنی نثر کے کارنامے واضح نہ ہو سکے۔ اس عہد میں بھی شاعری کو عروج حاصل ہوا۔ لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس عہد کی وجہ سے اورنگ آباد کو دکن کے مرکز کی حیثیت حاصل ہو گئی اور سارا دکنی ادب سمٹ کر اس علاقے کی حد تک محدود ہونے لگا۔ اس طرح اورنگ زیب عالمگیر کے دور میں دکنی نے اپنی روایت کو خیرباد کہا اور دہلی کے نئے قالب کو اپنے جسم سے جگہ دی۔ اس دور کے نثری کارنامے قصۂ گمنامی کے نذر ہو گئے۔

آصف جاہی دور :

دہلی میں مغلیہ سلطنت کمزور پڑ جانے کے بعد دکن کے بہت سے علاقے خود مختار ہو گئے جن میں آصف جاہی سلطنت کافی اہمیت کی حامل ہے۔ میر قمر الدین علی خاں آصف جاہ اول نے اس سلطنت کی ۱۷۲۴ء میں بنیاد رکھی اور اسی سلطنت نے اردو کی ترقی کا بیڑا اٹھایا۔ ہندوستان میں یہی وہ پہلی سلطنت ہے جس نے اردو زبان کو دورِ جدید میں کافی حد تک پروان چڑھایا۔ یہ سلطنت ہندوستان کی آزادی تک قائم رہی اور اس کے زیرِ اثر ادیبوں اور شعراء کی ہمت افزائی ہوتی رہی۔ اس دور میں لاتعداد تذکرے لکھے گئے۔ جن میں دکنی اور دہلوی شاعروں کے حالات اور کلام کو جگہ دی گئی تھی۔ چونکہ آصف جاہی دور کے تذکروں کی فہرست کافی طویل ہے اور اور تقریباً تمام تذکرے شائع ہو چکے ہیں اور جو مخطوطات کی شکل میں ہیں ان کا جائزہ دو ابواب "دکنی تذکروں کی امتیازی خصوصیات" اور "غیر مطبوعہ دکنی تذکروں کا تحقیقی جائزہ" میں لیا جا چکا ہے۔ اور بقیہ تذکروں کی فہرست مقالہ کے آخر میں شامل کر دی گئی ہے۔

اسی لیے اس عنوان کے تحت آصف جاہی دور کے ابتدائی عہد میں دکن میں جو تذکرے لکھے گئے ان کا تحقیقی اور تنقیدی محاکمہ پیش کیا جا رہا ہے تاکہ آصفی دور کے ابتدائی

تذکروں کا علم ہو سکے۔ اگرچہ یہ تذکرے بھی شائع ہو چکے ہیں لیکن ان پر تحقیقی نظر قدامت کی وجہ سے ضروری ہو جاتی ہے۔

گلشن گفتار:

دکن کے عموماً، اردو کے خصوصاً اولین تذکروں میں شمار کیا جاتا ہے جسے خواجہ خاں حمید اورنگ آبادی نے ترتیب دیا۔ اس تذکرہ کے متعدد قلمی نسخے مختلف لائبریریوں میں محفوظ ہیں۔ پروفیسر سید محمد نے ترتیب و حواشی کے ساتھ اکٹھا کیا گیا ہے اس تذکرہ کی سن تالیف ۱۱۵۲ء سے قبل خیال کی جاتی ہے جس کی بنیاد پر یہ اردو کا پہلا تذکرہ قرار پاتا ہے۔ تقریباً اسی عہد میں میر تقی میر نے تذکرہ "نکات الشعراء" لکھا تھا۔ گو کہ "نکات الشعراء" کو بھی اولیت حاصل ہے۔ لیکن گلشن گفتار کا مرتبہ اس وجہ سے بلند ہو جاتا ہے کہ اس تذکرہ کے مطالعے سے اندازہ ہوتا کہ اس نے آغاز سے اختتام کے تمام مراحل تھوڑی سی مدت میں طے کر لیے جبکہ میر نے اپنے تذکرہ کی تحریر کے لیے خاصا وقت صرف کیا۔

خواجہ خاں حمید تذکرہ لکھتے وقت میر کے نکات الشعراء سے ناواقف تھے۔ اس نے زیادہ تر شعراء کا تعارف نہایت مختصر انداز میں کروایا ہے۔ اس کے علاوہ یہ تذکرہ تو دکنی کے شعرا کے بارے میں لکھا گیا ہے لیکن اسلوب فارسی ہے۔ ڈاکٹر حنیف نقوی نے اس تذکرہ کا اجمالی جائزہ لیتے ہوئے بتایا ہے کہ حمید کی طرز تذکرہ نگاری سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے صرف اپنے تاثرات اور معلومات کو مجمل و مختصر جملوں میں پیش کیا ہے۔ انھوں نے گلشن گفتار پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے۔

ابتدائی سطور میں پیش کیے گئے دیباچہ کے اقتباس سے ظاہر ہے

"گلشن گفتار" کی ترتیب کسی سنجیدہ محرک کے بجائے تفریح طبع اور وقت گذاری کے خیال سے عمل میں آئی تھی"۔ [1]

ڈاکٹر حنیف نقوی کے اس بیان پر تبصرہ سے قبل یہ دیکھنا پڑے گا کہ دور قدیم کے کونسے تذکرہ نگار نے سنجیدہ محرک کے تحت تذکرہ نگاری کی۔ خود میر نے نکات الشعراء" لکھنے کے لیے ذاتی بغض کو بروئے کار لایا جس کا ذکر محمد حسین آزاد نے" آب حیات میں کیا ہے۔

" نکات الشعراء شاعر کے لیے بہت مفید ہے۔ اس میں شعرائے اردو کی بہت سی باتیں اس زمانہ کے لوگوں کے دیکھنے کے قابل ہیں مگر وہاں بھی اپنا انداز قائم ہے۔ دیباچہ میں فرماتے ہیں کہ یہ اردو کا پہلا تذکرہ ہے۔ اس میں ایک ہزار شاعر کا حال لکھوں گا مگر ان کو نہ لوں گا جن کے کلام سے دماغ پریشان ہو۔ ان ہزار میں ایک بے چارہ بھی طعنوں اور ملامتوں سے نہیں بچا۔" [2]

اس بیان سے بھی پتہ چلتا ہے کہ میر کا نکات الشعراء لکھنے کا مقصد بھی تفریح طبع اور وقت گذاری تھا۔ اگر کوئی سنجیدہ محرک کارفرما ہوتا تو وہ اپنے تذکرے میں اس دور کے تمام شعراء کو شامل کرتے کسی قسم کی تخصیص روا نہ رکھتے اس طرح ڈاکٹر حنیف نقوی کا اعتراض غلط ثابت ہو جاتا ہے کیونکہ قدیم دور میں نثر تفریح کی غرض سے ہی رواج پاتی رہی۔ اس کی بہترین مثال اردو کی نثری داستانیں جس کے ذریعہ نثر نگار فن پر توجہ سے زیادہ تفریح کے ذرائع فراہم کرنے پر زور دیتے

---

[1] شعرائے اردو کے تذکرے از ڈاکٹر حنیف نقوی ص ۲۶۱ و ۲۶۲

[2] آب حیات از مولانا محمد حسین آزاد ص

تھے۔ غرض خواجہ خاں حمید کا تذکرہ "گلشنِ گفتار" اس وجہ سے اہمیت کا حامل ہے کہ اس کے ذریعہ دورِ قدیم کے شاعروں کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ ایک ابتدائی نمونہ میں فن کی تلاش ایک مشکل امر ہے۔ ڈاکٹر حنیف نقوی گلشن گفتار کے مرتبہ کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جن دکنی شاعروں کا ذکر دوسرے تذکروں میں قطعاً مفقود ہے ان کے متعلق اس تذکرے کے بیانات سے اہلِ تحقیق کو بڑی مدد مل سکتی ہے۔"[1]

انھوں نے پروفیسر سید محمد کی تائید کرتے ہوئے اس تذکرہ کی حیثیت کو سراہا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ گلشن گفتار دکنی اور اردو کے تذکروں میں اپنی انفرادی خصوصیت کا نمائندہ ہے۔

چمنستانِ شعراء:

دکن کے ہم عصر تذکروں میں اس تذکرہ کا شمار کیا جاتا ہے جسے لالہ لچھمی نارائن شفیق نے تحریر کیا۔ اس کا سنہ تصنیف ۱۱۷۵ھ - ۱۷۶۱ء ہے جسے مولوی عبدالحق نے انجمن ترقی اردو ہند کی جانب سے ۱۹۲۸ء میں شائع کروایا۔ اس تذکرہ میں شفیق نے قاعدہ جمل کے بموجب حروف ابجد کے اعتبار سے ۲۱۳ شاعروں کے حالات اور کلام کو پیش کیا ہے۔ اس تذکرہ کی خصوصیت بھی یہی ہے کہ اس میں دکنی اور اردو کے شاعروں کے حالات جمع کیے گئے ہیں لیکن اس کا اسلوب فارسی ہے۔ لچھمی نارائن ایک اچھے شاعر اور نثر نگار تھے۔ انھیں غلام علی آزاد بلگرامی کی صحبت حاصل تھی یہی وجہ ہے کہ ان کا تذکرہ اردو کے جامع ترین تذکروں میں شمار کیا جاتا ہے۔

---

[1] شعرائے اردو کے تذکرے۔ از حنیف نقوی ص ۔ ومقدمہ گلشن گفتار

لچھمی نارائن شفیق کی تذکرہ نگاری کا اعتراف کرتے ہوئے ڈاکٹر حنیف نقوی نے لکھا ہے:

"تذکرہ نگاری کی تاریخ میں اتنے کم وقت کے اندر اتمام کار کی مثالیں نادر و نایاب تو نہیں لیکن کم یاب ضرور ہیں۔" [1]

شفیق نے بہت کم عرصہ میں تذکرہ ترتیب دیا اس کے باوجود ان کے تذکرہ میں تاریخ گوئی کا شغف واضح ہے جس کے ساتھ ساتھ شاعروں کے حالات اور انتخاب کلام کے موقع پر وہ سخن فہمی کا ثبوت دیتے ہیں۔ شعراء کے حالات زندگی کے بارے میں بقول ڈاکٹر حنیف نقوی "شفیق نے بالعموم انھیں باتوں کا اعادہ کیا ہے جو ان سے قبل دوسرے تذکرہ نگار لکھتے آئے ہیں" لیکن دیگر تذکرہ نگاروں کے مقابلہ میں شفیق کی انفرادیت یہی ہے کہ انھوں نے بعض شاعروں کے زمانہ ہائے وفات کا تعین کیا جو ان سے قبل کے کسی تذکرہ نگار نے انجام نہیں دیا تھا۔ ان کی اس جد و جہد کو سراہتے ہوئے لکھا ہے۔

"سوانح حیات کے ذیل میں سنین کی نشاندہی ایک بنیادی ضرورت کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن شعرائے اردو کے ابتدائی شعراء کے تذکروں کی یہ ایک بڑی خامی ہے کہ ان کے مولفین اس ضرورت کے احساس سے یکسر نا آشنا رہے ہیں۔ شفیق پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس روش عام کے خلاف واضح الفاظ میں بعض شاعروں کے زمانہ ہائے وفات کا تعین کیا ہے۔ اس امر میں تاریخ گوئی سے ان کی دلچسپی ایک اہم محرک کی حیثیت سے کارفرما رہی ہے۔ چنانچہ انھوں نے

---

[1] شعرائے اردو کے تذکرے از ڈاکٹر حنیف نقوی ص ۳۳۷

کہیں کہیں مفرد تاریخی مصرعے اور کہیں مکمل قطعات بھی بطور سند پیش کیے ہیں۔" لہ

چمنستانِ شعرا میں لچھمی نارائن شفیق نے خاکہ کشی، سیرت و شخصیت کو اجاگر کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ شاعروں کا طرز تعارف انوکھے انداز کا ہے اسی لیے ڈاکٹر حنیف نقوی نے لچھمی نارائن شفیق کے اس تذکرہ کو سیرت و کردار واخلاق وعادات کی پیش کشی کا نمونہ اور ادبی وفنی اکتساب کی تحسین و توصیف کی یادگار قرار دیا ہے۔ انھوں نے تذکرے کے دوران ان شاعروں کی طبیعت اور مزاج کے مختلف گوشوں کو بھی تبصرہ میں لایا ہے۔ بقول ڈاکٹر حنیف نقوی چمنستان شعراً میں ابتدائی دور کی عام روایات کے بخلاف تنقیدی مواد بھی خاصی مقدار میں موجود ہے۔" غرض اس تذکرہ کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ شفیق ذاتی طور پر غور و فکر کے ذریعہ مسائل کی تہہ تک پہنچنے کے عادی ہیں۔ اسی خصوصیت کی وجہ سے اس تذکرہ میں فن کا ارتقا سا نظر آتا ہے۔

لچھمی نارائن شفیق کا تذکرہ اردو ادب کا پہلا تذکرہ ہے جس میں فن کا نکھار شخصیت و سیرت نگاری کا پرتو، تعارف و تبصرہ کی جھلک، سوانحی انداز اور فنی وادبی شعور کا نمایاں اظہار دکھائی دیتا ہے۔ شفیق کی تاریخ نگاری بھی اس تذکرہ میں واضح ہوتی ہے۔ غرض یہ تذکرہ فن کے تمام لوازمات کی تکمیل کرتا ہے۔ اسی لیے اس کی ادبی حیثیت دوچند ہو جاتی ہے البتہ انتخاب کلام اور اندراجات کے موقع پر بعض اشعار غلطی سے اصل شاعر کی بجائے دوسرے شاعروں کے سرمایۂ افکار میں شامل ہو گئے ہیں۔ اس غلطی کو اس وجہ سے نظر انداز کیا جاسکتا ہے کہ دورِ قدیم میں کلام کا

لہ شعرائے اردو کے تذکرے۔ ڈاکٹر حنیف نقوی ص ۳۳۵

انتخاب بھی ایک کٹھن مرحلہ تھا۔ اس کے علاوہ شفیق سے اس قسم کی غلطی صرف دہلی کے شاعروں کے انتخاب کلام کے موقع پر ہوئی ہے۔ چونکہ شعرائے دہلی کا کلام حاصل کرنا اہل دکن کے لیے دشوار تھا اسی لیے شفیق کی یہ غلطی قابل برداشت ہے شاید اسی لیے حنیف نقوی نے کہا ہے کہ "ان معدودے چند خامیوں سے قطع نظر کرتے ہوئے بہ حیثیت مجموعی یہ تذکرہ کافی اہم اور قابل قدر ہے اور قدیم ادب سے متعلق تحقیق و تنقید کے مرحلے میں ایک ناگزیر ذریعہ معلومات کی حیثیت رکھتا ہے۔" [1]

شفیق کا یہ تذکرہ دکنی ادب کی معراج تصور کیا جاتا ہے بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اسی تذکرہ کے توسط سے اردو میں فن تذکرہ کی روایت پروان چڑھی کیونکہ شفیق ہی وہ پہلے تذکرہ نگار ہیں (جنہوں نے تذکرہ کے فنی اصولوں کو سلوک میں لایا) دکنی تذکروں میں چمنستان شعراء کو بنیاد کا درجہ حاصل ہے اگرچہ اس سے قبل شمالی ہند میں نکات الشعراء جیسا تذکرہ موجود تھا۔ لیکن اس میں فن کا نکھار نہ تھا۔ شفیق سے پہلے فن کو استعمال کرتے ہوئے یہ تذکرہ لکھا۔ شمالی ہند میں جتنے بھی تذکرے لکھے گئے وہ چمنستان شعراء کے بعد کے عہد سے متعلق ہیں۔ یہ تذکرہ سنہ ۱۷۶۲-۶۳ء میں ترتیب دیا گیا جبکہ گلشن راز، مخزن نکات اور طبقات الشعراء بالترتیب سنہ ۱۷۹۹ء ۱۷۹۳ء اور سنہ ۱۸۰۹ء کے مرتبہ ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ شفیق کا چمنستان شعراء ہی وہ واحد تذکرہ ہے جس میں پہلی بار تذکرہ کے فنی لوازمات کو بروئے کار لایا گیا۔ اس طرح یہ تذکرہ ادبی، فنی اور تاریخی اعتبار سے کافی اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اسی کے ذریعہ، اردو ادب، تذکرہ کے فن اور شعراء اردو کی تاریخ کا پتہ چلتا ہے

---

[1] شعرائے اردو کے تذکرے از ڈاکٹر حنیف نقوی ص ۱۶۳

بہار و خزاں :

دکن میں تحریر کردہ ہم عصر تذکروں کا تعلق اورنگ آباد کی سر زمین سے ہے تذکرہ "بہار و خزاں" کے مؤلف بہاء الدین حسین خاں عروج تھے اورنگ آباد کے رہنے والے تھے۔ چند سال پہلے تک اس کا ایک ناقص اور بوسیدہ و کرم خوردہ نسخہ کتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد میں محفوظ تھا لیکن اب اس کا سراغ نہیں ملتا۔ بقول ڈاکٹر حنیف نقوی "یوسف سرمست کی مرتب کی ہوئی فہرست سے ظاہر ہوتا ہے کہ مؤلف نے اس تذکرہ میں کم از کم ۱۸ شاعروں کے حالات اور اشعار درج کیے تھے" [1] اس تذکرہ کی سنہ تالیف کا پتہ نہ چل سکا۔ لیکن یہ حقیقت واضح ہے کہ اس کی تالیف تمنا اورنگ آبادی کے تذکرہ "گل عجائب" سے قبل ہوئی۔ چونکہ یہ تذکرہ اب عدم دستیاب ہے اسی لیے اس کے مواد و فن کے بارے میں کوئی بحث ناممکن ہے۔ البتہ اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس عہد میں اورنگ آباد کو مرکزیت حاصل ہو گئی تھی۔ چنانچہ ہم عصر تذکرے لکھنے والوں میں تمام کا تعلق اورنگ آباد ہی سے ہے اس کی سب سے بڑی وجہ یہ رہی کہ غلام علی آزاد بلگرامی کی فیض صحبت سے یہاں ایک ادبی ماحول پیدا ہو گیا تھا

جس کا نتیجہ یہ رہا کہ ہر قسم کی ادبی سرگرمیاں دکن کے اس قدیم شہر اورنگ آباد سے وابستہ ہو گئیں۔ یہاں تک کہ دکنی کے ابتدائی چار اہم تذکرے بھی اسی سرزمین پر لکھے گئے۔ اس تذکرہ اور اس کے مؤلف کے بارے میں معلومات حاصل نہ ہو سکیں۔ لیکن ڈاکٹر یوسف سرمست کے حوالے کی وجہ سے اسے دکنی تذکروں میں شمار کیا جا رہا ہے۔

---

[1] شعرائے اردو کے تذکرے صفحہ ۱۶۰ و ۳۴۸

گلِ عجائب:

دکن کے باشندہ اسد علی خاں تمنا اورنگ آبادی کا لکھا ہوا یہ تذکرہ ۱۹۳۶ء میں مولوی عبدالحق کے مقدمہ کے ساتھ انجمن ترقیٔ اردو ہند سے شائع ہوا۔ اس تذکرہ کا واحد قلمی نسخہ آصفیہ لائبریری میں محفوظ ہے جسے اب ریاستی آرکائیوز کے حوالے کیا گیا ہے۔ اس تذکرہ کی سنہ تالیف کے بارے میں مولوی عبدالحق نے اپنے مقدمے میں اور ڈاکٹر حنیف نقوی نے "شعرائے اردو کے تذکرے" میں طویل بحث کی ہے۔ ڈاکٹر حنیف نقوی نے اس تذکرہ کی سنہ تالیف ۱۷۸۲ء بتایا ہے اور ثابت کیا ہے کہ اس میں ۱۷۸۶ء تک اضافہ ہوتے رہے۔ ڈاکٹر نقوی کے مطابق تمنا نے اس تذکرے کی ترتیب کا کام ۱۷۸۰ء میں شروع کیا تھا[1] جس کے اختتام کے بعد بھی کئی اضافے کیے گئے۔ تمنا نے یہ تذکرہ اپنے دوست محمد کرم بخش سالم کی فرمائش پر ترتیب دیا۔ شاید خوب سے خوب تر کی تلاش میں انھوں نے بار بار اضافوں کو روا رکھا ہو۔

اسد علی خاں تمنا نے اس تذکرہ میں جن شاعروں کو شامل کیا ہے وہ ان کے ہم عصر اور ہم وطن تھے۔ یعنی انھوں نے اپنی زندگی میں ایسے شعراء کا تذکرہ لکھا جو یا تو اورنگ آباد اور اس کے متعلقہ علاقوں کے تھے یا کسب معاش کے سلسلے میں دکن آئے تھے۔ اس تذکرہ میں بیشتر شعراء دکن سے متعلق ہیں۔ تمنا نے اس قرب زمانی و مکانی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے جس کے ساتھ ہی وہ شعراء کی ولادت اور وفات کی تواریخ اور سنین لکھنے کا پورا خیال رکھتے ہیں۔ دکن کے دیگر تذکروں کی طرح یہ تذکرہ بھی دکن کے شعراء کا تعارف فارسی زبان میں کرواتا ہے۔

---

[1] شعرائے اردو کے تذکرے ص

تمنا کے تذکرہ کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے شعراء کے حالات اور واقعات کو بیان کرنے کے لیے ایسا اسلوب روا رکھا جس میں خود خالد شعور کی پختگی پوری طرح نمایاں ہے۔ اندازِ تعارف کی حد تک انھوں نے دکنی شعراء کی سوانح پر خاص توجہ دی ہے جبکہ شمالی ہند کے شعراء کے تعارف کے مرقع پران کی بے دلی صاف طور پر جھلکتی ہے۔ ویسے بھی اس تذکرہ میں شمالی ہند کے شعراء کی تعداد محض برائے نام کی حد تک ہے اس کی سب سے بڑی وجہ حصول معلومات کی دشواریاں محسوس ہوتی ہیں۔ پھر بھی تمنا نے ممکنہ حد تک ہر شاعر کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرنے کی سعی کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تذکرہ میں شعراء کی ولادت اور وفات کی سنین درج ہیں۔ تمنا کے اس تذکرہ کے بارے میں ڈاکٹر حنیف نقوی رقم طراز ہیں۔

"سیرت اور شخصیت اور کلام کے بارے میں تنقیدی مواد کی کمی کے باوجود "گل عجائب" کی تاریخی اور سوانحی پہلو کی اہمیت اسے ممتاز تذکروں کی فہرست میں شامل کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ اس تذکرہ سے دکنی شاعروں کے حالات زندگی کے بہت سے گوشے ہمارے سامنے آئے ہیں اور ایسے واقعات اور حقائق تک ہماری رسائی ہوئی ہے جن سے تاریخ ادب کی ترتیب میں کافی مدد مل سکتی ہے۔ [1]

تمنا کے تذکرہ میں فن تذکرہ کی جھلکیاں نمایاں ہیں لیکن سوانح کے علاوہ دیگر پہلوؤں کے لحاظ سے انھوں نے اس تذکرہ میں قریبی لوگوں سے واقفیت کی بناء پر ان کے حالات تفصیلی طور پر درج کیے جبکہ دور دراز کے شاعروں کے حالات کو سطحی انداز میں بیان کیا۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جو ان کے تذکرہ کو کسی قدر غیر معیاری کر دیتا

---

[1] شعرائے اردو کے تذکرے۔ از حنیف نقوی صفحہ ۲۸۸

لیکن اس بات کا اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ تمنا نے سوانح تحریر کرنے کے لیے مقدور بھر کوشش کی کہ ہر شاعر کے مکمل حالات اس میں درج کیے جائیں شاید اسی لیے انھوں نے تذکرہ میں کئی بار اضافے کیے۔ جیسے جیسے کسی شاعر کے بارے میں اہم معلومات حاصل ہوتی گئیں ویسے ہی اس کے بیان میں اضافہ کر دیا۔ یہی عمل تمنا کے ذہن کو تحقیقی انداز رکھنے والا بنا دیتا ہے کیونکہ انھوں نے اپنی تحریر کو حرفِ آخر کا درجہ نہیں دیا بلکہ اضافوں کے ذریعہ تذکرہ کو جامع ترین سوانح کا مجموعہ بنانے کی کوشش کی۔ ان کا یہ عمل انہیں شعوری تذکرہ نگار کا درجہ دیتا ہے۔ غالباً تمنا ہی اُردو کے پہلے تذکرہ نگار ہیں جنہوں نے ابتدائی مواد پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جیسے جیسے مواد حاصل ہوتا گیا اس سے تذکرہ کو زینت بخشی۔ اسی خصوصیت کی وجہ سے تمنا کا تذکرہ اردو ادب میں گراں قدر اضافہ کا درجہ رکھتا ہے کیونکہ ہم عصر تذکروں میں کسی نے بارہا تصحیح اور اضافے کے عمل کو اختیار نہیں کیا جبکہ ایک تحقیقی عمل میں بارہا مواد کی دستیابی کے ساتھ ساتھ اضافے بھی کیے جاتے ہیں۔ چونکہ انھوں نے اس عمل کو نہ صرف اختیار کیا بلکہ اسے عملی طور پر بھی پیش کیا ہے اسی لیے اُردو تذکرہ نگاروں کی فہرست میں اسے خاص درجہ حاصل ہے۔

تحفۃ الشعراء :

دکن میں تحریر کردہ تذکروں میں تحفۃ الشعراء ایک ایسا تذکرہ ہے جس میں ۶۲ شاعروں کا ذکر موجود ہے۔ افضل بیگ قاقشال اورنگ آبادی نے اسے ۱۱۶۵ھ م ۱۷۵۲ء میں مرتب کیا۔ مخطوطے کے ذریعہ سن ترتیب کا سال واضح نہیں کیا گیا بلکہ عارف خالد بن عاجز اور آزاد بلگرامی کے قطعات تاریخ کے توسط سے ۱۱۶۵ء کا خیال کیا جاتا ہے۔ اس کا شمار اردو کے ابتدائی تذکروں میں کیا جاتا ہے۔ قاقشال نے بیشتر فارسی گو شعراء کا تعارف کروایا ہے جبکہ صرف ۱۰ اردو شعراء کا ضمناً ذکر کرتے ہوئے

ڈاکٹر حنیف نقوی لکھتے ہیں۔

"مولوی عبدالحق اور ان کے ہمنوا بھی اسے شعرائے اردو کے تذکروں میں شمار کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک اصولاً یہ فیصلہ درست نہیں کیونکہ تحفۃ الشعراء کی اصلی حیثیت فارسی تذکرے کی ہے اور اسے اسی نظر سے دیکھنا ہوگا" [1]

تحفۃ الشعراء کے بارے میں ڈاکٹر حنیف نقوی کا یہ استدلال اس تذکرے کے مواد کی غمازی کرتا ہے۔ ان کا یہ کہنا قطعی اصولی ہے کہ چونکہ اس تذکرہ کا بیشتر مواد فارسی شعرائے سے متعلق ہے اسی لیے اسے فارسی تذکروں میں جگہ دی جانی چاہیے۔ اس استدلال کے دوران ڈاکٹر حنیف نقوی اس حقیقت کو نظرانداز کرجاتے ہیں کہ جس دور میں یہ تذکرہ لکھا گیا اس وقت اُردو کے شاعر کسی علیحدہ زبان سے متعلق افراد نہیں ہوا کرتے تھے بلکہ فارسی گو شعراء ہی اردو یا دکنی میں شاعری کیا کرتے تھے اسی لیے یہ امکان ہے کہ قاقشال نے جن فارسی شعراء کو اپنے تذکرہ میں شامل کیا ہے ان کا اردو کلام بھی رہا ہو جو زمانہ کی دست و برد کے نتیجہ میں ہمیں دستیاب نہ ہوسکا ہو۔ اس کے علاوہ ایک ایسے دور میں جبکہ اردو کا کوئی تذکرہ نہ ہو فارسی شعراء کی سوانح لکھتے ہوئے اُردو شاعروں کے حالات بھی تذکرہ میں شامل کردینا بڑی اہمیت کا حامل ہو جاتا ہے کیونکہ آج کے دور میں دو لسانی اور سہ لسانی کارگزاریوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ فضل بیگ قاقشال نے اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے یہ تذکرہ لکھا ہو۔ اس اعتبار سے تحفۃ الشعراء کو خاص مقام ملنا چاہیے کیونکہ قدیم دور میں اس تذکرہ نے دو لسانی خصوصیات کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ قاقشال کا یہ تذکرہ عہد قدیم میں ذو لسانی خصوصیات کا حامل ہونے کی وجہ سے کافی اہمیت

---

[1] شعرائے اردو کے تذکرے از ڈاکٹر حنیف نقوی صـ ۱۴۲

رکھتا ہے۔ تحفتہ الشعراء کو انفرادیت حاصل ہے کہ اس تذکرہ کے ذریعہ قدیم دور میں دو زبانوں کے شعراء کے حالات کو یکجا کرنے کی پہلی بار کوشش کی گئی جو کامیاب رہی اور یہ عمل دور جدید کا خاصہ ہے۔ ایک ایسے دور میں جبکہ اُردو کے سب سے پہلے تذکرے عالم وجود میں آئے۔ قاقشال کی یہ جدت نظر انداز نہیں کی جاسکتی۔ اسی عہد میں میر تقی میر نے "نکات الشعراء" لکھا اور اردو کے دیگر دو تذکرے ظہور میں آئے۔ ایک ایسے دور میں جبکہ اردو کے ابتدائی تذکرے لکھے گئے اور تذکرہ کا فن Take of کے عہد میں داخل ہوا۔ قاقشال کی یہ کوشش سراہنے کے قابل ہے۔

تحفتہ الشعراء میں مواد۔ متن اور سیرت کی پیشکشی میں وہی خامی موجود ہے جو اُردو کے دیگر ابتدائی تذکروں میں دکھائی دیتی ہے۔ شعرا کے حالات اور واقعات کے بیان میں تاریخی استدلال کی کمی۔ سنین اور تواریخ کا عدم استعمال مختصر تعارف کا انداز ترتیب، کلام میں غیر جامعیت اور ایسی ہی دیگر کئی بے ضابطگیاں ہیں جو اس تذکرہ کو ابتدائی ہونے کی وجہ سے قابل معافی سمجھی جاسکتی ہیں۔ حنیف نقوی کا اعتراض اس تذکرہ کو اردو کے تذکروں میں شمار نہ کیا جائے کہ اس وجہ سے قطعی غلط ہے کہ کسی بھی کتاب میں مواد کی کثرت وقلت پر فیصلہ صادر کرنا دور جدید کی خصوصیت ہے جبکہ قدیم زمانے میں اس قسم کا التزام نہ تھا اسی لیے تحفتہ الشعراء کو اُردو تذکروں میں شمار کرنا صرف ادبی تاریخ کی تدوین کا حق ادا ہونے کے برابر ہے بلکہ اس کی وجہ سے دکنی تذکروں میں ایک نئے پن کا اظہار بھی ہوتا ہے۔

غرض دکنی تذکروں نے قطب شاہی، عادل شاہی، نظام شاہی، بریدشاہی، عالمگیری اور آصف جاہی دور کے ذریعہ ارتقاء حاصل کیا۔ ان تمام ادوار میں آصف جاہی دور کے ذریعہ ارتقاء حاصل کیا۔ ان تمام ادوار میں آصف جاہی دور کو اس لیے اولیت حاصل ہے کہ اسی عہد میں دکن میں بیشتر تذکرے لکھے گئے۔ ان کے

علاوہ دکن میں کچھ ایسے دور رہے ہیں جو گمنامی کی حد تک مشہور ہیں جیسے بہمنی دور ۱۳۴۷ء تا ۱۵۲۸ء ، گجرات کا مظفری دور ۱۳۹۶ء تا ۱۵۷۲ء میں خاندیس کا فاروقی دور ۱۳۸۲ء تا ۱۶۰۱ء۔ مالوہ کا غوری دور ۱۳۹۲ء تا ۱۵۳۱ء یہ تمام دور دکن کے احاطہ میں آتے ہیں۔ لیکن انھوں نے دکنی ادب کی ترقی کے لیے کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا۔ البتہ بہمنی دور اور مظفری دور میں دکنی نثر و نظم کے نمونے مل جاتے ہیں لیکن تذکرے کمیاب ہیں اسی طرح مدراس میں بھی مسلمانوں کا تسلط رہا لیکن دور قدیم میں کوئی ادبی کارنامے ظاہر نہیں ہوئے۔ مستقبل کی تحقیق شاید یہ ثابت کردے کہ ان قدیم دکنی علاقوں میں بھی کسی دور میں دکنی زبان کا بول بالا رہا ہے۔ اس طرح دکنی تذکرے علاقہ دکن میں سب سے پہلے ۱۵۰۱ء میں ظہور میں آئے اور جب سے آج تک اس کا سلسلہ جاری ہے۔ آصف جاہی دور کے اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں تحریر کردہ تذکرے شائع ہو چکے ہیں اسی لیے انھیں زیر بحث لانے کی بجائے مقالہ کے میں بطور فہرست شامل کیا گیا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دور آصفی میں سب سے زیادہ اُردو کی نمائندگی ہوی اور علاقہ دکن میں اسی دور میں سب سے زیادہ تذکرے لکھے گئے۔ اردو میں دیگر علوم و فنون کو پھیلانے کے ساتھ ساتھ اُردو کو تذکروں کا بیش بہا ذخیرہ عطا کرنے کی وجہ سے دور آصفی کی یاد تازہ رہے گی۔

باب پنجم

غیر مطبوعہ دکنی تذکروں کا تحقیقی جائزہ

دکنی تذکروں کے تحقیقی جائزے اور تنقیدی اظہار سے اندازہ قائم ہوتا ہے کہ دکن میں نہ صرف مذہبی اور سوانحی تذکرے لکھے گئے تہذیب اور تمدن کی روایت کو بھی تذکروں میں قائم رکھنے کی کوشش کی گئی۔ دکنی تذکرے نہ صرف ایک عہد کی یادگار ہیں بلکہ اس عہد کی تہذیب اور تمدن کے بھی نمائندہ ہیں یہی وجہ ہے کہ دکنی تذکروں کی غیر مطبوعہ اور غیر مطبوعہ فہرست کے جائزے سے اندازہ قائم ہو جاتا ہے کہ دکنی تذکرہ نویسوں نے تذکرہ کی روایت کو فن سے زیادہ تہذیب سے مربوط رکھا۔

دکن میں موجود مخطوطات اور مطبوعات کی طویل فہرست میں تذکرہ کا فن اپنی نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ دکن کے قلمی تذکروں میں ادبی، مذہبی، سیاسی اور سماجی ہستیوں کے کارنامے محفوظ کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ بعض تذکروں میں صرف کلام کے انتخاب پر بھی توجہ دی گئی ہے۔ ذیل میں دکنی قلمی تذکروں کی تفصیل وضاحت کے ساتھ پیش کی جاتی ہے تاکہ کتب خانوں میں محفوظ دکنی تذکروں میں موجود مواد اور متن کے ساتھ ساتھ تذکرہ نگار کے انداز اور اس کے مزاج سے

واقفیت حاصل ہوسکے۔ ان غیر مطبوعہ دکنی تذکروں کے تعارف کے دوران ابجدی ترتیب کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔

آثار الاوثان:

تاریخی انداز پر تحریر کردہ یہ تذکرہ سالار جنگ میوزیم لائبریری کے شعبۂ مخطوطات میں ۵۱۱ نمبر پر محفوظ ہے۔ یہ تذکرہ سنہ ۱۳ھ کے بعد لکھا گیا جس کے مؤلف سید محمد محی الدین خاں اورنگ آباد عدالت کے ناظم صدر تھے۔ چھ ابواب پر مشتمل اس تذکرہ میں پہاڑوں پر تعمیر شدہ کل پچھتر ۷۵ مورتیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ۱۹۴ صفحات پر مشتمل اس تذکرہ میں ہر باب کے ساتھ مختلف مقامات کے مندروں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ سر ورق کے بعد مقدمہ اور پھر کوہستانی مندروں کے بانیوں کے ذکر کے ساتھ ساتھ ہر فرقہ کے افراد کی دیویوں کی علامتوں کو بھی ظاہر کیا گیا ہے۔ درحقیقت یہ کتاب دو حصوں میں تقسیم کی جاسکتی ہے پہلے حصہ میں جنوبی ہند (دکن) کے مختلف مقدس معابدوں کا ذکر کرتے ہوئے مؤلف نے ہندو مذہب کے پچھتر ۷۵ فرقوں کے نام گنوائے ہیں اور پھر اورنگ آباد کے مندروں کے ساتھ ساتھ ایلورہ اور اجنتا کے غاروں کے معابدوں کے بارے میں مختصر معلومات فراہم کی ہیں۔ اس پہلے حصے میں چار مختلف ابواب کے ذریعہ مولف نے تشریحی انداز اپنایا ہے۔ چنانچہ حصہ اول میں اورنگ آباد کے مندروں کا بیان، حصہ دوم میں ایلورہ کی عالی شان عمارتوں اور تراشیدہ غاروں کا ذکر، حصہ سوم میں اجنتا کے انتیس ۲۹ غاروں کی تفصیلات کے ساتھ ساتھ مہایان فرقہ کے مخصوص غاروں کی بھی وضاحت کی ہے۔ جبکہ حصہ چہارم میں کروسہ اور مومن آباد کے غاروں کے حالات قلمبند کیے گئے ہیں۔ اس طرح "آثار الاوثان" کے ابتدائی حصہ میں ہندوستان کے مشہور غاروں کا ذکر کیا گیا ہے جن میں ہندو مذہب کے مختلف معابدوں کی پرستش کی جاتی ہے۔

ایک لحاظ سے یہ تذکرہ ہندو مذہب کی عبادت گاہوں کے بارے میں مختصر تاریخی مو
پیش کرتا ہے۔

"آثار الاوثان" کے دوسرے حصہ میں پانچ ابواب قائم کیے گئے ہیں۔ جن
کے ذریعہ برٹس انڈیا کے چونتیس ۳۴ مقامات کا ذکر کیا گیا ہے۔ جہاں پہاڑی علاقو
پر مورتی کی پوجا کی جاتی ہے۔ باب اول میں مدراس، بجواڑہ، مہاولی پور کی کوہستا
مندروں کا ذکر ملتا ہے۔ باب دوم میں برا بار، راجگڑھ، سیتا مرہٹی اور بہار
کے غاروں اور معابدوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ باب سوم میں بمبئی، ناسک، کار
اور مہار سے متعلقہ غاروں کی تفصیلات درج کی گئی ہیں۔ اسی طرح باب چہار
میں کٹک کے غار۔ باب پنجم میں کاٹھیاواڑ کے غار اور باب ششم میں راجپوتانہ
غاروں اور پہاڑوں پر تعمیر کردہ مندروں کے ذکر کے ذریعہ مؤلف نے یہ
وضاحت کی ہے کہ دکنی تذکرہ نویسوں نے فن تذکرہ کو شاعروں اور ادیبوں کے
حالات پیش کرنے کی حد تک محدود نہیں رکھا بلکہ قومی یادگاروں کو محفوظ رکھنے
واحد ذریعہ بھی بنا دیا۔ "آثار الاوثان" دکنی تذکروں میں کسی قوم کی تعمیری
یادگاروں کو محفوظ رکھنے کی وجہ سے منفرد مقام کی حامل ہے۔

تذکرہ جوہر فرد

ملیح آباد کے شاعروں کے کلام کو جمع کر کے سید محمد علی ملیح آبادی نے اس تذکرہ
کے ذریعہ بغیر کسی ابجدی ترتیب کے کلام کی ترتیب کو ہی تذکرہ کا درجہ دے دیا۔
عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری کی قلمی کتابوں میں اس کی سنہ تالیف ۱۹۰۹ء میں درج کی
گئی ہے۔ صفحہ ۱ تا ۵ مولف نے مقدمہ میں اس بات کی وضاحت کی ہے کہ وہ ۹۔
ربیع الاول ۱۳۲۷ھ کو حیدرآباد سے ملیح آباد پہنچے مختلف مشاعروں میں شرکت کے

بعد انہیں یہ ذوق پیدا ہوا کہ ملیح آباد کے شاعروں کے کلام کو یکجا کیا جائے جس کے نتیجہ میں ان کا یہ تذکرہ عالم ظہور میں آیا۔ مقدمہ میں مؤلف نے وضاحت کر دی ہے کہ مختصر سے قیام کے دوران ملیح آباد کے شعرا کے حالات اور ان کے کارنامے یکجا کرنے کا کوئی موقع دستیاب نہیں ہوا۔ اسی لیے کلام کی ترتیب پر اکتفا کیا گیا ہے۔ مولف کے اس اظہار سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اس تذکرہ میں صرف شاعروں کے منتخبہ کلام کو محفوظ کرنے پر توجہ دی۔ شاید اسی کا نتیجہ ہے کہ تذکرہ میں ابجدی ترتیب کا خیال نہیں رکھا گیا۔ ہر صفحہ پر جلی حرفوں میں شاعر کا نام اور اس کے تخلص کے ساتھ غزل کے نمونے پیش کر دیئے گئے ہیں۔ تقریباً چونتیس شعرا کے کلام کو ۳۰۰ صفحات پر ترتیب دیا گیا ہے۔ یہ تذکرہ اس وجہ سے اہمیت کا حامل ہے کہ اس کے مطالعہ سے ۱۹۰۹ء میں ملیح آباد میں موجود شعرا کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ چونکہ اس تذکرہ کو حیدرآباد میں مقیم مولف نے لکھا ہے۔ اسی لیے اس کا شمار دکنی تذکروں میں کیا جاتا ہے۔

"تذکرہ جوہر فرد" کا مکمل متن شعرائے ملیح آباد کے بارے میں منتخبہ کلام کو پیش کرتا ہے۔ لیکن اس کا شمار اس وجہ سے دکنی تذکروں میں کیا جائے گا کہ سید محمد علی ملیح آبادی نے حیدرآباد سے سفر کے بعد اس تذکرہ کو تحریر کیا۔ دکنی تذکروں میں یہ واحد تذکرہ ہے جس کی ترتیب کے لیے مؤلف نے نہ صرف سفر اختیار کیا بلکہ ملیح آباد کے شعرا کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے تحقیقی طریقہ بھی اپنایا۔ اردو کے تمام تذکروں میں یہ روایت پائی جاتی ہے کہ تذکرہ نگار اپنے وطن میں بیٹھ کر دیگر مقامات کے شعرا کے بارے میں مواد فراہم کرتے ہیں جس سے حقائق میں غلو شامل ہونے کی گنجائش پیدا ہو جاتی ہے۔ دکن کے بہت کم تذکرے ایسے ہیں جن کی ترتیب کے موقع پر مؤلف نے عملی طور پر اپنی ذات کو شعرا کے حالات جمع کرنے کے لیے متحرک رکھا ہو

بلکہ شمالی ہند کے تذکروں میں بھی ایسی مثال کمیاب ہے۔ اس تذکرہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ دکنی تذکرہ نویس متن کی پیش کشی کے وقت عملی اقدام کو بھی خصوصی اہمیت دیتے تھے۔ "تذکرہ جوہر فرد" دکنی تذکروں میں اس حیثیت سے انفرادی مقام رکھتا ہے کہ اس ترتیب میں شخصی دل چسپی کا عکس اور عملی اقدام کی جھلک دکھائی دیتی ہے جبکہ اردو کے تمام تذکروں میں متن کی فراہمی کے دوران عملی اقدامات کا عام طور پر فقدان ہے۔

تذکرۂ خاندان نواب رفعت الملک :

امیر وامراء کے خاندان اور ان کے حسب نسب کے علاوہ ان کی قابلیت کے بارے میں تذکرہ لکھنے کی روایت دکن ہی میں پروان چڑھی چنانچہ حکیم شمس اللہ قادری ایک ایسے نامور مورخ گذرے ہیں جنہوں نے تاریخی استدلال کے ذریعہ تذکرہ کی روایت میں تحقیق کے انداز کو شامل کیا۔ "تذکرہ، خاندانِ نواب رفعت الملک" اسی خصوصیت کی یادگار ہے۔ ۱۹۳۷ء میں تحریر کردہ یہ تذکرہ اسٹیٹ سنٹرل لائبریری کی قلمی کتابوں میں محفوظ ہے۔

حکیم شمس اللہ قادری نے اس تذکرہ میں نواب رفعت الملک کے خاندانی حالات کے ساتھ ساتھ نواب رکن الدولہ، سید لشکر خاں وزیر اعظم امیر الممالک آصف الدولہ، نواب صلابت جنگ کے حالات بھی قلمبند کیے ہیں۔ ابتدائی طور پر نواب کے خاندانی حالات کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے حسب نسب اور کارناموں کی وضاحت کی گئی ہے۔ تاریخی انداز کے اس تذکرہ میں فارسی، اردو اور انگریزی کتابوں سے استفادہ بھی کیا گیا ہے۔ اور کتاب کے آخر میں نواب رفعت الملک کا خاندانی شجرہ بھی درج کیا گیا ہے۔ درحقیقت یہ حیدرآباد کے ایک جاگیردار خاندان کا تذکرہ ہے جو نہایت تحقیق اور جستجو کے بعد تحریر کیا گیا ہے۔ اس خاندان کے آخری مشہور فرد

میر ہاشم علی خان ہائیکورٹ کے جج تھے
اور ان کے فرزند عالم علی خاں بودھن شوگر فیکٹری کے اعلیٰ عہدہ دار رہے ہیں۔
اس تذکرہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ دکن کے تذکرہ نویسوں نے صرف مذہبی اور ادبی تذکرے نہیں لکھے بلکہ جاگیردار خاندان کے حالات کو بھی تذکرہ کے روپ میں پیش کیا۔ شمس اللہ قادری کا یہ تذکرہ دکن کے شاہانہ خاندان کے حالات اور ان کے جاہ وجلال کا پتہ دیتا ہے۔ اس تذکرہ کو خاندانی تذکرہ" کا نام دیا جاسکتا ہے۔

تذکرۂ خوش نویساں :

کتابت اور خوش خطی کے فن کی تاریخ اور تحریر کے مختلف طریقوں کے علاوہ خط نسخ، خط کوفی اور خط نستعلیق کے بانی اور ان کی طرزِ تحریر کو بام عروج تک پہنچانے والے مختلف خوشنویس حضرات کی مختصر سوانح اور ان کے کارناموں کو مرزا محمد علی نے "تذکرہ خوش نویساں" کے نام سے ترتیب دیا ہے سالار جنگ میوزیم لائبریری کے شعبہ مخطوطات میں محفوظ یہ تذکرہ ۱۳۲۳ھ میں تالیف کیا گیا۔ مولف نے مقدمہ میں وضاحت کردی ہے کہ اس تذکرہ کی تالیف کا اصل سبب مقامی حکومت کی جانب سے اعلان کردہ ایک مراسلہ ہے جس کے ذریعہ آصفیہ سلطنت کے سربراہوں نے خوشنویسی کی تاریخ اور اس فن میں یکتائے روزگار افراد کی سوانح ترتیب دینے پر خصوصی توجہ دی تھی۔ مرزا محمد علی نے اس تذکرہ کے ذریعہ کوشش کی ہے کہ مختلف خوشنویسوں کی تاریخ مدون کی جائے۔

مرزا محمد علی نے اس تذکرے میں خوشخطی کی ابتدا اور عرب و ایران میں اس کے ماہرین کی مختصر تاریخ کو پیش کرتے ہوئے تقریباً پچپن خوشنویسوں کے مختصر

حالات درج کیے گئے ہیں۔ جس کے ساتھ ہی خوش نویسی کے آٹھ طریقوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان خطوط کے بانی اور ان کے کارناموں کے جائزے کے ساتھ ساتھ دنیا کے مختلف ممالک میں خوشنویسوں کی کارگزاریوں کے بارے میں مختصر ذکر بھی کیا گیا ہے۔ مؤلف نے ہر خوشنویس کی سوانح جمع کرنے سے زیادہ ممکنہ طور پر تاریخ پیدائش اور وفات درج کر دی ہے۔ ۲۷ صفحات پر مشتمل اس تذکرہ میں سنہ ۳۲۰ھ سے کر سنہ تالیف تک کے مشہور خوشنویسوں کا مختصر مگر جامع ذکر کیا گیا ہے۔

اس تذکرہ میں خوشنویسوں کی شخصیت کے بارے میں مواد فراہم نہیں ہوتا لیکن اس کی اہمیت اس وجہ سے دوبالا ہو جاتی ہے کہ اردو تذکروں میں یہہ واحد تذکرہ ہے جس کے ذریعہ خوشنویسوں کے حالات کو یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگرچہ فنی اعتبار سے اس تذکرہ میں کئی خامیاں موجود ہیں لیکن اردو میں سب سے پہلی مرتبہ خوشنویسوں کے حالات یکجا کرنے کی وجہ سے یہ تذکرہ انفرادی حیثیت کا حامل ہو گیا ہے۔ مؤلف نے اس تذکرہ میں خوشنویسوں کے حالات کے علاوہ خوشنویسی کے فن کو بھی اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ تذکرہ کے آخر میں خوشخطی کی شناخت، شان وشیوہ اور سواد قلم کے زیر عنوان فن خوشنویسی پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ مولف کے نزدیک تحریر کی خوب صورتی، رخ، کرسی، شکل اور زور قلم سے عبارت ہے۔ خوش خطی کے اصول مدون کرنے کی وجہ سے مرزا محمد علی صرف تذکرہ نگار ہی نہیں بلکہ فن خوشنویسی کے پہلے نقاد قرار پاتے ہیں۔ مرزا محمد علی دکن کے مشہور خوش نویس تھے اور دفتر صدر محاسب میں منصب دار دیوانی اور صیغہ دار کے عہدوں پر فائز تھے۔

ان کے تذکرہ کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک باشعور

خوشنویس ہونے کے علاوہ فن تحریر کے بارے میں وقیع معلومات بھی رکھتے تھے جس کی بہترین مثال دکنی تذکرہ "تذکرۂ خوش نویساں" ہے جس میں فن خوشنویسی کی تاریخ، خوش خطی کے موجدین اور مشہور زمانہ خوش نویسوں کے مختصر حالات اور ان کے کارناموں کو اکٹھا کیا گیا ہے۔ اُردو کے بیشتر تذکرے شاعروں اور ادیبوں کے حالات اور کارناموں کے نمائندہ ہیں۔ جبکہ "تذکرہ خوشنویساں" اُردو کا پہلا تذکرہ ہے جس میں خوش نویسوں کے ذکر کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس انفرادی خصوصیت کی وجہ سے "تذکرۂ خوش نویساں" دکنی تذکروں میں فن تذکرہ کی عام ڈگر سے بالکلیہ مختلف ہونے کی غمازی کرتا ہے۔ شاعروں اور ادیبوں کے بجائے خوش نویسوں کے تذکرہ کی ترتیب دکنی تذکروں میں ایک اہم اضافہ کا درجہ رکھتی ہے۔ جس کی بہترین مثال "تذکرہ خوش نویساں" سے دی جاسکتی ہے جو دکنی تذکرہ کے فن کو متحرک رکھنے کے لیے دکن کے تذکرہ نگاروں کی جدوجہد کا مظہر ہے۔

تذکرۂ شعراء:

ہم عصر علماء اور شعراء کے حالات قلمبند کرنے کے لیے شیخ محمد علی حزیں نے "تذکرۂ شعراء" لکھا۔ جو ادارۂ ادبیات اُردو کے شعبہ مخطوطات میں محفوظ ہے۔ سنہ ۱۱۶۵ھ میں تصنیف شدہ اس تذکرہ کی کتابت سید محمد الحسینی نے سنہ ۱۱۸۹ھ میں بمقام اورنگ آباد انجام دی۔ شیخ محمد علی حزیں اصفہان کے رہنے والے تھے۔ سنہ ۱۱۰۳ھ میں ہندوستان تشریف لائے اور اس دور کے معاصرین کے کارناموں کو "تذکرۂ شعراء" کے زیر عنوان ترتیب دیا۔ اس تذکرہ میں ۱۱۲ شعراء کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ مولف نے تذکرہ کو دو فصلوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلی فصل میں معاصرین علماء کا ذکر موجود ہے جبکہ دوسری فصل میں معاصرین

شعراء کے حالات قلمبند کیے گیے ہیں۔ اس تذکرہ میں اکثر علماء اور شعراء ایران سے تعلق رکھتے ہیں لیکن متعدد ایسے ہیں جو ہندوستان آئے تھے اور بعضوں نے اردو میں بھی شعر کہے ہیں۔ مؤلف نے تذکرہ میں اس بات کی صراحت بھی کردی ہے کہ ایسے شعراء جن میں مؤلف کی ملاقات نہ ہوسکی۔ ان کے اشعار درج کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی سوانح کے بارے میں اشاروں سے کام لیا گیا ہے۔ دکنی تذکروں میں معاصرین کے حالات پیش کرتے ہیں۔"تذکرۂ شعراء" اپنی انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔

تذکرہ کی آخری عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ مؤلف نے اس تذکرہ کی یں صرف نو دن میں کی۔ اس تذکرہ کی یہ ایک اہم خصوصیت ہے کہ تصنیف کے صرف ۲۴ سال بعد اس کی کتابت عمل میں آئی۔ کاتب سید محمد الحسینی تھے مرزا محمد کرم علی کی فرمائش پر اس تذکرہ کو خود مولف کے اصل نسخہ سے نقل کیا ہے۔ نستعلیق شکستہ خط میں کاتب نے عنوانات کو سرخ روشنائی سے ظاہر کیا ہے اور کتابت کے لیے دولت آبادی کاغذ استعمال کرکے روشن سیاہی کے ذریعہ مخطوطہ کو خوب صورت بنایا گیا ہے۔

شیخ محمد علی حزیں کا تعلق اصفہان سے تھا لیکن وہ اپنی آخری عمر میں ہندوستان آئے اور جنوبی ہند کی قطب شاہی سلطنت سے وابستہ ہوگئے۔ ان کے تذکرہ میں حروف تہجی کا التزام نہیں ہے۔ انھوں نے فرقۂ علماء کی فصل کا آغاز ہندوستان کے مشہور عالم صدرالدین سید علی خاں سے کیا ہے جو عبداللہ قطب شاہ کے داماد اور نظام الدین احمد دشتکی کے فرزند تھے اور جنہوں نے اپنی بیشتر عمر حیدرآباد میں گذاری تھی۔ غرض یہ تذکرہ عام نوعیت کی نمائندگی کرتا ہے۔ شیخ محمد علی حزیں نے اس تذکرہ میں جدت پسندی کو ملحوظ نہیں رکھا بلکہ عام روایتی انداز سے تذکرہ کی ترتیب پر توجہ دی۔

تذکرہ شعراء" اپنی مخصوص نہج کی وجہ سے انفرادیت رکھتا ہے۔ اگرچہ مؤلف

نے اس تذکرہ کا نام "تذکرۂ شعراء" رکھا ہے لیکن علماء اور شعراء کے ارتباط کے ذریعہ اس تذکرہ کو گلدستہ بنا دیا ہے۔ علماء اور شعراء کے اختلاط کے ذریعہ اس تذکرہ کو گلدستہ نما بنا دیا ہے۔ عام طور پر اردو کے تمام تذکرے یا تو شعراء کے حالات پیش کرتے ہیں یا پھر علماء اور صوفیاء کے کارنامے بیان کرتے ہیں۔ لیکن شیخ محمد علی حزیں کے اس تذکرہ کی اہم خصوصیت یہی ہے کہ اس تذکرہ میں علماء، اور شعراء کے حالات کو یکجا کیا گیا ہے۔ دور قدیم سے ہی واعظ اور شاعر میں اختلاف چلا آیا ہے اور اکثر شعراء نے رند مشرب خیالات کے ذریعہ مذہبی روایت کو توڑنے کی کوشش کی جس کا نتیجہ یہ رہا کہ شاعری نے مذہبی تصورات سے انحراف کیا۔ محمد علی حزیں کے تذکرہ کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ اردو کے پہلے تذکرہ نگار ہیں۔ جنہوں نے مذہبی علماء، اور شعراء کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کی کوشش کی "تذکرۂ شعراء" میں اس کی عملی مثال موجود ہے جس سے واضح ثبوت ملتا ہے کہ جنوبی ہند کے تذکرہ نویسوں نے اردو تذکرہ کے فن کو انفرادیت دلانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اس امتیازی خصوصیت کی وجہ سے شیخ محمد علی حزیں کی تالیف "تذکرۂ شعراء" دکنی تذکروں میں ممتاز مقام رکھتی ہے۔

تذکرۂ طوطیان ہند

دکنی تذکروں میں یہ واحد تذکرہ ہے جس کے ذریعہ (خواتین) شاعرات کے حالات اور ان کا کلام یکجا کیا گیا ہے۔ یہ تذکرہ ادارۂ ادبیاتِ اردو کی قلمی کتابوں میں محفوظ ہے اور اس کا "تذکرہ مخطوطات ادارہ ادبیاتِ اردو" کی جلد پنجم میں کیا گیا ہے۔ مولانا تمکین کاظمی نے ۱۹۲۸ء میں اس تذکرہ کی ترتیب کا آغاز کیا جس کی تکمیل ۱۹۳۶ء میں ہوئی اس تذکرہ میں اردو زبان کے آغاز سے لے کر عہد حاضر تک اردو شعر کہنے والی خواتین کا ذکر موجود ہے۔ مولف نے خواتین کے تخلصوں کو حروف ابجد کے لحاظ

سے ترتیب دے کر ان کے حالات اور نمونۂ کلام درج کیا ہے۔ اس تذکرہ میں تقریباً ۲۷۵ شاعرات کے احوال اور نمونہ کلام شریک ہے۔ تذکرہ کا آغاز اختر کے کلام سے ہے اور متعدد گمنام شاعرات کے کلام کے نمونوں پر تذکرہ کا اختتام عمل میں آیا ہے۔ یہ تذکرہ خود مؤلف کا مسودہ ہے۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ نے اس تذکرہ پر تبصرہ کرتے ہوئے اس کی ضخامت اور متن کی تعریف کی ہے۔

مولانا تمکین کاظمی حیدرآباد کے نامور اساتذہ میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کا ادبی شغف شعر و شاعری رہا لیکن اس تذکرہ کی ترتیب کے ذریعہ انھوں نے شاعرات کے کلام کو اکٹھا کر کے دکنی تذکروں کی روایت میں گوناگوں اضافہ کیا ہے۔ اس تذکرہ کی اہم خصوصیت یہی ہے کہ دکن میں ترتیب دیے جانے کے باوجود اس تذکرہ میں بیشتر شمالی ہند کی شاعرات کا بھی ذکر موجود ہے۔ مولانا کاظمی نے ممکنہ طور پر شاعرہ کے حالات جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔ متن کی عدم دستیابی کی صورت میں گمنام شاعرات کا کلام بطور نمونہ پیش کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مؤلف نے ادبی دیانت داری سے کام لیا ہے۔ دکنی تذکروں میں "تذکرہ طوطیان ہند" شاعرات کا ذکر ہونے کی وجہ سے انفرادیت رکھتا ہے۔

تذکرہ کی روایت اور فنی اصول "تذکرہ طوطیان ہند" میں پوری طرح واضح ہیں۔ مولف نے منتخبہ کلام کے ذریعہ اپنے ادبی مزاج کا ثبوت دیتے ہوئے اس تذکرہ میں ایسی شاعرات کو بھی جگہ دی ہے جن کا ذکر اس سے قبل کے کسی اردو تذکرہ میں موجود نہیں۔ مولانا تمکین کاظمی کا یہ تذکرہ اس حیثیت سے دکنی تذکروں میں اہمیت کا حامل ہے کہ مؤلف نے پہلی بار اردو کی خواتین شاعرات کے حالات اور کلام کو یکجا کرنے پر توجہ دی۔ اسی انفرادی حیثیت کی وجہ سے "تذکرہ طوطیان ہند" دکن کے ممتاز تذکروں میں شمار کیا جاتا ہے۔

تذکرۂ عطائے تمکین :

دکن میں تحریر کردہ اس تذکرہ کو "تذکرۂ شاگرداں" کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس تذکرہ میں شاہ نصیر اور ان کے شاگرد، حافظ تاج الدین مشتاق اور ان کے شاگرد کے علاوہ حافظ میر شمس الدین فیض اور ان کے سلسلے کے ۳۵۱ شعرائے کے حالات اور نمونہ کلام درج کیا گیا ہے۔ سید محی الدین قادری زور نے اس تذکرہ کا نام "تذکرہ عطائے تمکین" رکھکر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ تذکرہ تمکین کاظمی کا عطیہ ہے۔ درحقیقت اس تذکرہ کا کوئی عنوان نہیں اور نہ ہی اس پر تاریخ تالیف درج ہے۔ مولانا تمکین کاظمی نے ۱۲ر ستمبر ۱۹۵۸ء کو یہ تذکرہ اپنی دستخط کے ساتھ ادارۂ ادبیات اردو کے حوالے کیا۔ کیونکہ اس تذکرہ میں شعراء کی تاریخ وفات کے سلسلے میں سنہ ۱۲۹۲ھ آخر میں درج ہے۔ اسی لیے سنہ تالیف کا اندازہ اسی تاریخ کو برقرار دیا گیا ہے۔ مولانا تمکین کاظمی نے درمیانی اوراق پر حسب ذیل تحریر درج کی ہے۔

> "یہ ایک تذکرہ ہے جس کا کچھ حصّہ حکیم بہبود علی صاحب صفی مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اور اس پر نوٹس ابو محمد عمر الصلاح یافعی نے بھی لکھے ہیں۔ یہ بھی اسی حالت میں پرانی کتابوں کی دکان سے ملا جسے میں ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد میں محفوظ کروا رہا ہوں تاکہ کام آسکے۔" [1]

اس تحریر کے آخر میں تمکین کاظمی نے شرحد ستخط کے ساتھ تاریخ بھی درج کر دی ہے۔ اس تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ دکن میں لاتعداد تذکرہ لکھے گئے اور ان کے بیشتر مسودات ردّی کے حوالے ہو گئے۔ اگر اس تذکرہ کو مولانا تمکین کاظمی تلاش

نہ کرتے تو یہ بھی ضائع ہو جاتا۔

دکنی تذکروں میں اس تذکرہ کو اس لیے خصوصی اہمیت حاصل ہے کہ اس تذکرہ میں صرف حیدرآباد کے اردو شاعروں کا ذکر ہے۔

اس کے علاوہ مؤلف نے حیدرآباد کے تین بڑے اساتذہ کے شاگردوں کو اس تذکرہ میں جگہ دی ہے کیونکہ یہ تذکرہ صرف شاگردوں کے احوال پیش کرتا ہے اور اردو تذکروں میں اس قسم کا کوئی تذکرہ ابھی تک دستیاب نہیں ہوا اسی لیے تذکرہ عطائے تمکین " اساتذہ شعراء سے اکتساب کرنے والے شاگردوں کا نادر تذکرہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ جس میں شاگرد شعراء کے حالات اور ان کے کلام کو پیش کر کے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ دکنی شعراء کے شاگردوں کی تعداد ہزاروں میں ہوتی تھی اور وہ ادب اور فن کی خدمت کو اپنا خصوصی مسلک سمجھتے تھے۔ دکن میں تحریر کردہ یہ تذکرہ اردو کے دیگر تذکروں میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔

ریاضِ حسنی :

دکنی تذکروں میں نوادرات کی حیثیت رکھنے والا یہ تذکرہ سنٹرل ریکارڈ آفس حیدرآباد کی لائبریری میں محفوظ ہے اور اس کا شمار بھی ان نایاب تذکروں میں کیا جاتا ہے جو طباعت سے محروم ہیں۔ اس تذکرہ کے مولف خواجہ عنایت اللہ فتوت اورنگ آباد کے متوطن اور سرکار آصفیہ کے منصب دار تھے۔ اس تذکرہ پر ڈاکٹر حنیف نقوی نے اپنی کتاب شعرائے اُردو کے تذکرے میں تفصیلی بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ تذکرہ املا کی لاتعداد غلطیوں اور تحریر کے بے شمار نقائص سے بھرپور ہے اور ریکارڈ آفس کی فہرستِ مخطوطات میں نصیر الدین ہاشمی نے "ریاض حسنی" کو مکمل تذکرہ بتایا ہے۔ جب کہ تذکرہ کا آغاز صفحہ ۴۷ سے ہوتا ہے۔ اسی طرح حنیف نقوی نے اس تذکرہ کی

شانِ نزول کے بارے میں لکھا ہے کہ خواجہ محمد اکرام نے سید عبدالولی عزلت کے کتب خانہ سے متعدد دواوین اور تذکرے عنایت اللہ فتوت کے حوالے کیے جن کے مطالعہ کے بعد فتوت نے یہ تذکرہ لکھا۔ جس میں شاعروں کے حالات درج ہیں۔

ڈاکٹر حنیف نقوی نے "ریاضِ حسنی" کی شانِ نزول پر بحث کے لیے جو طریقہ اپنایا ہے وہ درحقیقت یک طرفہ تنقید کا آئینہ دار ہے۔ کیونکہ حنیف نقوی نے بتایا ہے کہ مختلف تذکروں کے مطالعہ کے بعد عنایت اللہ فتوت نے یہ تذکرہ بطور کتابی شکل تحریر کیا۔ حنیف نقوی کے نزدیک یہ عمل قابلِ ستائش نہیں جبکہ کامیاب تذکرہ کی یہی خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ متعدد کتابوں کے مطالعہ کے بعد لکھا جاتا ہے اور فتوت نے اس عمل کو برقرار رکھتے ہوئے یہ تذکرہ لکھا ہے۔ مختلف دواوین اور تذکروں کے مطالعہ کے بعد "ریاضِ حسنی" جیسا تذکرہ لکھنا خود اس بات کی دلیل ہے کہ مؤلف نے جگر کاوی کے ساتھ اس تذکرہ کو ترتیب دیا ہے جبکہ حنیف نقوی اس عمل کو کسی قدر گراں باری سے دیکھتے ہیں۔

"شعرائے اردو کے تذکرے" میں حنیف نقوی نے "ریاضِ حسنی" کے دیباچہ اور تذکرہ کے متن پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے۔

> "دیباچہ میں جو اہم اور قابلِ ذکر امور زیرِ بحث آئے ہیں ان کا ماحصل یہ ہے کہ عمر کی ایک ایسی منزل میں جبکہ "انتشارِ حواس" اور "ابتدائے ناتوانی" کے باعث زندگی کی تمام رنگینیاں گریز پائی پر مائل تھیں اور "وحشتِ مزاج" کسی طرح شکیبائی سے آشنا نہ ہوتی تھی۔ خواجہ محمد اکرام نے سید عبدالولی عزلت کے کتب خانہ سے جو ان کے زیرِ انتظام تھا، شعرائے متقدمین اور متاخرین کے دواوین اور بعض دوسری کتابیں مہیا کر کے مؤلف کے لئے "دلبستگی" اور تفریحِ طبع کا سامان فراہم کیا

ان کتابوں میں سراج الدین علی خاں آرزو کا تذکرہ "مجمع النفائس" بھی تھا جو مطالعہ کے بعد ان کے دل میں "ایجادِ تذکرہ ہندی" کی خواہش پیدا ہوئی۔ چنانچہ دسترس کے حدود میں رہتے ہوئے انھوں نے مختلف شاعروں کے حالات اور اشعار جمع کیے اور انہیں ایک تذکرہ کے طور پر کتابی صورت میں مرتب کر دیا۔ مختصراً یہی اس تذکرہ کی شانِ نزول ہے۔" [1]

ڈاکٹر حنیف نقوی نے اس بیان کے ذریعہ مختصر طور پر "ریاض حسنی" کے دیباچہ کو جامع طور پر واضح کیا ہے۔ لیکن دیے ہوئے الفاظ میں اس امر کی وضاحت کی ہے کہ عنایت اللہ فتوت کا یہ تذکرہ تالیف سے زیادہ توارد کی حیثیت رکھتا ہے جبکہ اردو کے تمام تر تذکرے فارسی تذکروں کے تتبع میں لکھے گئے اور بیشتر تذکروں میں دیگر تذکروں سے استفادہ کا عمل صاف طور پر ظاہر ہے۔ جس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ بہترین اور جامع تذکرے کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ وہ متن کی پیشکش میں کئی تذکروں کے مطالعہ کے بعد لکھا جائے۔ فتوت کے الفاظ "ایجادِ تذکرۂ ہندی" سے صاف ظاہر ہے کہ انہوں نے مطالعہ کے بعد "ریاض حسنی" مرتب کیا۔ اس خصوصیت کی بنا پر فتوت اردو کے پہلے محقق تذکرہ نگار قرار پائیں گے۔ کیونکہ انہوں نے "ریاض حسنی" کی ترتیب کے لیے مختلف تذکروں کا مطالعہ کیا۔

"ریاض حسنی" کے مطالعہ سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ خواجہ عنایت اللہ فتوت اردو کے پہلے تذکرہ نگار ہیں جنہوں نے ادبی دیانت داری کا ثبوت

---

[1] شعرائے اردو کے تذکرے از: ڈاکٹر حنیف نقوی ص ۲۸۸

دیتے ہوئے اپنے دیباچہ میں صاف صاف بیان کر دیا کہ کسی قدر مطالعہ کے بعد ان کی طبیعت ایک نیا تذکرہ ایجاد کرنے کی جانب مائل ہوئی۔ اس کے علاوہ تالیف کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ مختلف کتابوں کے مطالعہ کے بعد ظہور میں آتی ہے۔ ڈاکٹر حنیف نقوی نے "شعرائے اردو کے تذکرے" میں گردیزی اور فتوت کی تحریروں کا تقابل بھی کیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ "ریاض حسنی" ترجمہ شدہ تذکرہ ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ گردیزی اور فتوت کے تذکروں میں بعض شعرائے کے حالات کی ترتیب میں کسی قدر الفاظ میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ لیکن ڈاکٹر حنیف نقوی کا یہ بیان کہ فتوت نے دیدہ دلیری کے ساتھ تذکرۂ گردیزی کے مشتملات پہ شبخون مارا ہے" کسی حد تک بے ادبی کی دلیل ہے۔ فتوت پر سرقے کا الزام قطعی غلط ہے کیونکہ انھوں نے گردیزی کے تذکرے سے جامع ترین انداز کو اپنایا ہے۔

"ریاض حسنی" کی تاریخ تصنیف کے بارے میں بھی ڈاکٹر حنیف نقوی نے طویل بحث کے ذریعہ نصیر الدین ہاشمی کے متعین کردہ سنہ تالیف ۱۱۷۵ھ کو غلط ثابت کیا ہے۔ اور مختلف بیانات کے حوالے سے ثابت کیا ہے کہ فتوت کا یہ تذکرہ درحقیقت ۱۱۷۳ھ میں تالیف کیا گیا۔ نصیر الدین ہاشمی کے مضمون میں سنہ تالیف ۱۱۷۵ھ جو درج ہے جو سہواً لکھی گئی ہے۔ درحقیقت ۱۱۷۵ھ نسخہ کی کتابت کی تاریخ ہے۔ اس طرح "ریاض حسنی" کی تاریخ تالیف ۱۱۷۳ھ قرار پاتی ہے جس کے نتیجہ میں نصیر الدین ہاشمی کی وضع کردہ تاریخ غلط ثابت ہو جاتی ہے۔ "ریاض حسنی" فتوت کا کوئی عظیم کارنامہ نہیں اور نہ ہی اس تذکرہ سے ادب میں کوئی اضافہ ہوا ہے بلکہ اس کی حیثیت دکن میں تحریر کردہ ایک تذکرہ کی وجہ سے اہمیت رکھتی ہے۔ فتوت کے تذکرہ میں فنی طور پر خامیاں موجود ہیں۔ لیکن تذکرہ نویسی کے فن کو دکن میں فروغ دینے کی وجہ سے فتوت کا تذکرہ کافی اہمیت رکھتا ہے۔

دکن کی غیر مطبوعہ قلمی کتابوں میں فن تذکرہ سے متعلق موجود مخطوطات کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ بہمنی دور سے لے کر عہد حاضر تک دکن کے ادیبوں نے لاتعداد تذکرے لکھے لیکن زمانے کی دست برد نے انہیں تباہ کردیا۔ جنوبی ہند کے کتب خانوں میں محفوظ تذکروں کے علاوہ کئی مذہبی اور ادبی تذکرے شخصی کتب خانوں میں پراگندہ حالت میں موجود ہیں۔ کرنول، مدراس، خلد آباد، برہان پور، بنگلور اور دیگر ایسے مقامات جہاں مذہبی علماء اور اولیائے کرام قیام پذیر تھے اب بھی قلمی کتابوں کے ذخیرے موجود ہیں۔ لیکن جن کی تحویل میں یہ کتابیں موجود ہیں وہ بطور تبرک محفوظ رکھنا ان کتابوں کا بہتر استعمال تصور کرتے ہیں۔ جس کے نتیجہ میں ان کتابوں تک پہنچ بہت مشکل کام ہے۔ غرض دستیاب شدہ قلمی کتابوں میں موجود تذکرے "آثارالاوثان" "تذکرہ جوہر فرد" تذکرۂ خاندان نواب رفعت الملک، تذکرۂ خوش نویساں، تذکرۂ شعراء، تذکرۂ طوطیانِ ہند۔ تذکرۂ عطائے تمکین اور ریاض حسنی کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ دکن کا علاقہ فن تذکرہ نگاری کو فروغ دینے کے معاملے میں کافی زرخیز رہا ہے۔ اسی کے نتیجہ میں بیشتر اردو کے تذکرے سرزمینِ دکن سے عالم ظہور میں آئے۔ دکن میں تحریر کردہ تمام غیر مطبوعہ تذکرے اپنی انفرادی حیثیت رکھنے کے علاوہ جدّت پسندی کے علمبردار بھی ہیں۔ ہر دکنی تذکرہ نگار نے تذکرے کو نئے انداز اور نئی فکر سے وابستہ رکھنے کی کوشش کی۔ اس طرح دکن کے غیر مطبوعہ تذکرے اردو ادب میں اختراعی ذہنیت رکھنے کی وجہ سے اہمیت کے حامل ہو گئے۔

غیر مطبوعہ دکنی تذکروں کا بیشتر ذخیرہ سالار جنگ میوزیم لائبریری اور سنٹرل ریکارڈ آفس کے شعبہ مخطوطات میں محفوظ ہے کیونکہ دکنی ادب کا بیشتر ذخیرہ زمانے کے تغیرات کے باوجود حیدرآباد میں محفوظ رہا۔ اسی

لیے مخطوطات کی کثیر تعداد یہاں موجود ہے۔ دکنی تذکروں کے مخطوطات میں جن انفرادی خصوصیات کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ دکنی تذکرہ نویس اپنے عہد کے دانشور تھے۔ جس کا واضح ثبوت انھوں نے تذکرہ نویسی کے دوران دیا۔ غرض دکنی تذکروں کے مخطوطات اُردو ادب میں زرین اضافہ کا درجہ رکھتے ہیں۔

○○

باب ششم

دکنی تذکروں کی امتیازی خصوصیات

جنوبی ہند کے مختلف علاقوں میں تحریر کردہ تذکروں کو "دکنی تذکرے" کا نام دیا جاتا ہے۔ یعنی دکنی تذکروں سے مراد دکن کے علاقوں میں لکھی گئی وہ تمام کتابیں تصور کی جائیں گی جن سے شاعروں اور ادیبوں کی سوانح لکھی گئی ہو اور ان کے طرز تحریر کے نمونے پیش کیے گئے ہوں۔ دکن میں لکھے گئے تذکروں کی طویل فہرست ہے۔ جن میں نہ صرف سوانحی مواد دستیاب ہوتا ہے بلکہ دکنی میں شعر و ادب کے عہد کے بارے میں بھی معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ اگرچہ دکنی تذکروں میں شخصیات اور ان سے متعلق متن کی پیشکشی کا دائرہ محدود ہے لیکن اس حقیقت سے گریز نہیں کیا جا سکتا کہ دکنی تذکرہ نویسوں نے فن تذکرہ کو کئی حیثیتوں سے برتا ہے ۔ اور لفظ تذکرے کے معنی کو ہمہ گیر حیثیت دے دی۔ دکنی تذکروں کی امتیازی خصوصیات یہی ہے کہ تذکرہ نویسوں نے دکن میں جس قدر تذکرے لکھے ان میں ہر اعتبار سے فن تذکرہ کو منفرد حیثیت کا حامل بنانے کی کوشش کی ۔ دکنی تذکروں میں یہ روایت عام نظر آتی ہے کہ یہاں تذکرہ نویسوں نے فن تذکرہ کو نہ صرف خصوصی حیثیت دلانے کی کوشش کی بلکہ تذکرہ کی فارسی روایت کو بھی توڑ دیا۔ جس کے نتیجہ میں دکنی تذکرہ نویس اس فن کو صرف تاریخ یا سوانح کے طور پر استعمال نہیں کرتے بلکہ تذکرہ کے مفہوم کو وسیع معنی کا علمبردار بنا کر اسے خصوصیت بخشتے ہیں جن

کی وجہ سے دکنی تذکرے امتیازی حیثیت کے حامل ہو جاتے ہیں۔

دکن میں تحریر کردہ مطبوعہ و غیر مطبوعہ لاتعداد تذکروں کا محاکاتی جائزہ لیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ دکن کے تذکرہ نویسوں نے تذکرہ کے لفظ کو تاریخ، سوانح، سیرت، شخصی سوانح، ادبی سوانح، مذہبی سوانح، کارنامۂ ملازمت، تاریخ ادارہ، ذخیرہ معلومات، تاریخ عمارت، تاریخ شجرہ اور تاریخ خطابات کے طور پر استعمال کیا۔ لفظ تذکرہ کو اس ہمہ گیری کے استعمال کرنے کا امتیازی وصف دکنی تذکرہ نویسوں ہی کو حاصل ہے۔ جنوبی ہند کے تذکرہ نویسوں کے مقابلہ میں شمالی ہند کے تذکرہ نگار اس امتیازی خصوصیت کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ دکن کے فن کاروں نے تذکرہ کی فنی روایت سے کسی قدر علیحدگی اختیار کرتے ہوئے جدت پسندی کو فن کی خصوصیت میں شامل کیا جب کہ ایسی منفرد مزاجی شمالی ہند کے تذکرہ نویسوں میں کمیاب رہی۔ یہی وجہ ہے کہ دکنی تذکرے رنگا رنگی خصوصیات کے حامل ہیں۔ جن میں سوانح کے ساتھ ساتھ کارناموں اور تاریخ و سیرت کی جھلکیاں بھی پوری طرح واضح ہیں۔ فن تذکرہ کی روایت سے کسی قدر اختلاف کر کے اسے جدت پسندی سے وابستہ کرنا دکنی تذکروں کی امتیازی خصوصیات میں شامل ہے۔ جن خصوصیات کی بنا پر دکنی تذکرے منفرد حیثیت کے حامل قرار دیئے گئے ہیں۔ بطور ثبوت پیش کرنے کے لیے چند عنوانات قائم کیے گئے ہیں تاکہ یہ دلیل پیش کی جاسکے کہ دکنی تذکرہ نویسوں نے فن تذکرہ کو کس قدر منفرد مزاجی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

۱۔ تذکرہ بطور کارنامۂ ملازمت۔

۲۔ تذکرہ بطور تاریخ ادارہ۔

۳۔ تذکرہ بطور ذخیرہ معلومات۔

۴۔ تذکرہ بطور تاریخ عمارت

۵۔ تذکرہ بطور شجرہ۔

۶۔ تذکرہ بطور خطبہ و خطابات۔

۷۔ تذکرہ بطور سیرت۔

۸۔ تذکرہ بطور شخصی سوانح۔

۹۔ تذکرہ بطور ادبی سوانح۔

۱۰۔ تذکرہ بطور مذہبی سوانح۔

۱۱۔ تذکرہ بطور تاریخ

دکنی تذکرہ نویسوں نے فن تذکرہ کو کسی ایک مخصوص صنف کے لیے محدود نہیں رکھا بلکہ لفظ تذکرہ کو اتنی جامعیت بخش دی کہ تذکرہ کا فنی روایت سے علحدہ ہو گیا۔ دکن میں تذکرہ کی روایت ایک علمی دُھن کی حیثیت سے فروغ پائی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر تذکرہ نویس نے لفظ تذکرہ کی معنویت کو اپنے مخصوص طرزِ فکر سے وابستہ کر کے روایت شکنی اور فن تذکرہ کی اصولی بندشوں کو لا محدود کر دیا۔

تذکرہ بطور کارنامہ ملازمت :

دکن میں تحریر کردہ تذکروں کی طویل فہرست میں چند ایسے تذکرے بھی ہیں میں سوانحی حالات سے زیادہ ملازمت کے کارناموں کو پیش کیا گیا ہے یعنی دکنی تذکرہ نویسوں نے صرف حالاتِ زندگی کی پیشکشی کو تذکرہ کا روپ نہیں دیا بلکہ زندگی کی ایک بہت بڑی ضرورت ملازمت کے حالات کو بھی ضروری تصور کر کے فن تذکرہ کی روایت میں شامل کیا۔ چنانچہ دکنی تذکرہ نویسوں کی تحریروں میں دو ایسے تذکرے بھی شامل ہیں جن میں دوران ملازمت پیش آنے والے حالات کو تذکرہ کے روپ میں ظاہر کیا گیا ہے اس خصوص میں محمد تراب علی تذکرہ ملازمت کے دیباچہ میں لکھتے ہیں :

"چونکہ میرے لیے اس وقت تک کسی مستقل جائیداد کا تعین نہیں ہوا ہے اور جس کے لیے اکثر مجھے سرکار میں یاددہی کرنی پڑتی ہے۔ اور ان حالات کے ضروری حصے کو بار بار عرض کرنا اور عرائض یاددہی میں ان کا لکھنا طوالت سے خالی نہ تھا اس لیے بعض ضروری کاغذات کو جمع کرکے طبع کروائے ہیں۔" [1]

تذکرہ کے فن کو کارنامہ ملازمت کی حیثیت سے پیش کرتے ہوئے محمد تراب علی نے اپنی کتاب "تذکرہ ملازمت" میں ملازمت کے کارناموں کے مراسلوں اور ستائشی مراسلوں کو یکجا کرکے تذکرہ کا روپ دے دیا ہے۔ کتاب کے حصۂ اوّل میں ملازمت کے حالات اور اس کے وثائق پیش کیے گئے ہیں۔ اور حصہ دوم میں نتائج کارگذاری اور لیاقت نامہ جات مرقومہ افسرانِ بالا جمع کردیئے گئے ہیں۔ حصۂ اول میں ۵۳ مراسلوں کے ذریعہ خط وکتابت کا حوالہ دیا گیا ہے اسی طرح حصہ دوم میں ۵۵ مراسلوں کے ذریعہ ان کی خدمات کو اپنے سراہنے اور آفیسروں کے ذریعہ احکامات کے اجرا کرنے کا ذکر ملتا ہے۔ محمد تراب علی ایک استاد کی حیثیت سے اپنی ملازمت انجام دے رہے تھے اور انھوں نے یہ تذکرہ اپنی جز وقتی ملازمت کو ہمہ وقتی میں تبدیل کرنے کے لیے تحریر کیا۔ کتاب کے آخر میں ان کی تقرری کے لیے اسپیشل تحصیلدار کی سفارش کا ذکر ملتا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ محمد تراب علی نے ملازمت کے مراسلوں کو ترتیب دے کر اسے تذکرہ کا نام دے دیا۔ درحقیقت یہ تراب علی کی ملازمت کے زمانے کا تذکرہ ہے اور انھوں نے دورانِ ملازمت اپنی خدمات سے ظہور میں آنے والی خدمات کو تحریری روپ دے کر اسے تذکرہ کی صنف میں شامل کردیا جس سے

---

[1] تذکرہ ملازمت از محمد تراب علی خاں مطبوعہ مشیر دکن حیدرآباد سنہ ۱۳۱۹ ف

اندازہ ہوتا ہے کہ دکن میں تحریر کردہ تذکرے صرف سوانحی مواد پیش کرنے کی حد تک محدود نہیں رہے بلکہ دکنی تذکرہ نویسوں نے زندگی میں درپیش تمام مسائل کے دوران اختیار کردہ رویے کو تذکرہ کی شکل دے دیا جس کی مثال "تذکرۂ ملازمت" سے دی جاسکتی ہے جس کے وسیلے سے تراب علی نے ملازمت کے کارناموں کو مرتب کرکے اسے تذکرہ کا نام دیدیا ہے۔

دکن میں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تذکروں کی فہرست میں اس قبیل کے کئی تذکرے ملتے ہیں جن میں اس فن کو ملازمت کے کارناموں کے لیے بھی مختص کیا گیا ہے جس کی ایک مثال "تذکرۂ زیبا"[1] سے دی جاسکتی ہے۔ اس تذکرہ کو سید محمد تقی اور سید شرف الدین نے ترتیب دیا۔ درحقیقت یہ تذکرہ لطیف یار جنگ کی ملازمت محکمۂ آبکاری میں ان کی خدمات سے متعلق ستائشی مواد پیش کرتا ہے۔ اس تذکرہ میں وداعی اور تہنیتی تقاریب کی روئیداد اور تقاریر کو لطور تذکرہ پیش کیا گیا ہے۔ لطیف یار جنگ کی وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوشی اور سید محمد تقی کے تقرر کی تہنیت میں یہ تذکرہ لکھا گیا۔ جس میں مختلف نظمائے آبکاری اور صیغہ دار اور انسپکٹرس کے احساسات اور جذبات کو جو وداعی تقاریر کے دوران پیش کیے گئے۔ تذکرے کی شکل دے دی گئی ہے۔ اس تذکرہ میں تقاریر کے ساتھ ساتھ قصائد اور قطعات بھی درج ہیں مخمس کی شکل میں یادگار نظمیں بھی تحریر کی گئی ہیں۔ اس طرح یہ تذکرہ ایک گلدستہ کی حیثیت رکھتا ہے جس میں لطیف یار جنگ کی ملازمت اور ان کے کارناموں کو سراہتے ہوئے انہیں وداع کیا گیا اور نئے ناظم کی حیثیت سے سید محمد تقی کا استقبال کیا گیا۔ درحقیقت یہ تذکرہ وداعی و استقبالیہ تقریب کی ایک روئیداد ہے۔ جس میں نثر و نظم کے ذریعہ خراج پیش کرنے کے طریقے کو روا رکھا گیا ہے۔ قصیدہ نما نظمیں اور نثری مضامین کے جائزے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سید شرف الدین نے اپنے اس

---

[1] تذکرۂ زیبا۔ مؤلف سید شرف الدین۔ مطبوعہ شمس المطابع حیدرآباد ۱۳۴۵ھ

تذکرے کو بطور کارنامہ ملازمت پیش کرتے ہوئے خراجِ عقیدت کے طریقہ کو اپنایا جس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ دکن کے تذکرہ نویسوں نے فن تذکرہ کو امتیازی خصوصیت کا حامل بنانے کے لیے اس کی ہیئت میں کئی تبدیلیاں کیں جس کی وجہ سے تذکرہ دکنی دور میں ایک فعال صنف کی حیثیت کا حامل ہوگیا۔

تذکرہ بطور تاریخ ادارہ :

دکنی تذکروں کی ایک امتیازی خصوصیت یہ بھی ہے کہ دکن میں لکھے گئے تذکرے صرف سوانحی مواد کی حد تک محدود نہیں رہے بلکہ دکن کے تذکرہ نویسوں نے ادارہ جات کی تاریخ لکھنے کے لیے بھی تذکرے کے فن کو بروئے کار لایا ہے۔ دورِ قدیم سے ہی یہ روایت چلی آرہی تھی کہ کسی کی شخصیت اور کارناموں کے بارے میں مواد پیش کرنے کو تذکرے کا نام دیا جائے۔ دکنی تذکرہ نویسوں نے نہ صرف اس قدیم اندازکی روایت شکنی کی بلکہ تذکرہ کو فنی طور پر متعدد قسم کے اظہارات سے بھی وابستہ کردیا جس کی ایک بہترین مثال دکن میں تحریر کردہ تذکروں میں ادارہ جات کی تاریخ کو یکجا کرنے سے دی جاسکتی ہے۔ دکن میں لکھے گئے تذکروں میں تذکرۂ دارالعلوم اور "تذکرہ شعبۂ قانون" یہ ایسے تذکرے ہیں جن میں ادارے اور شعبہ جات کی تاریخ کو منضبط کرنے کا ثبوت ملتا ہے۔

"تذکرۂ دارالعلوم"[1] نصیرالدین ہاشمی کا تحریر کردہ تذکرہ ہے جس میں انھوں نے حیدرآباد کے مشہور مدرسہ دارالعلوم کی ابتداء سے تاریخ درج کی ہے۔ حیدرآباد میں تعلیم کی شروعات کے اعتبار سے دارالعلوم سب سے پہلے مدرسہ

---

[1] تذکرہ دارالعلوم از نصیرالدین ہاشمی مطبوعہ حیدرآباد دکن ۱۳۶۲ھ

معلومات فراہم کرتا ہے بلکہ مدرسۂ دارالعلوم کی ابتداء، محرکات، طرزِ تعلیم، اساتذہ طلباء اور اس عہد کی تعلیمی مشغولیات کے بارے میں تفصیلات بھی پیش کرتا ہے۔ ریاست حیدرآباد میں نصابی اور تعلیمی تحریکات کے ابتدائی دور میں اس مدرسہ کا قیام عمل میں آیا یہی وجہ ہے کہ حیدرآباد کی تعلیمی تاریخ میں اس مدرسہ کو اولیت حاصل ہے۔ نصیر الدین ہاشمی نے "تذکرۂ دارالعلوم" لکھ کر نہ صرف اس مدرسہ میں درس و تدریس کے طریقوں کے بارے میں تفصیلات تحریر کی ہیں بلکہ اس تذکرے کے ذریعہ کی تاریخ تحریر کرنے کی روایت کو بھی فروغ دیا ہے۔ نصیر الدین ہاشمی کے اس تذکرے سے دکنی تذکروں میں اس فن کو لبطور تاریخ ادارہ تحریر کرنے کی کوشش کا پتہ چلتا ہے۔

دکن میں تذکرے کے فن کو متعدد مفاہیم کے لیے استعمال کیا گیا تذکرہ نویسوں نے کسی ادارہ۔ اسوسی ایشن، تنظیم اور انجمن کی تاریخ کو مبسوط کتابی شکل دے کر اُسے بھی تذکرے کے نام سے معنون کیا۔ جس کی ابتدائی مثال نصیر الدین ہاشمی کی کتاب "تذکرۂ دارالعلوم" سے دی گئی۔ دکن میں تحریر کردہ اسی قبیل کا ایک اور تذکرہ دستیاب ہوا ہے جسے عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبہ قانون نے ترتیب دیا اور "تذکرہ شعبہ قانون"[۱] کے نام سے جامعہ عثمانیہ سے ملحقہ شعبۂ قانون کی تاریخ کو تحقیقی انداز میں پیش کیا ہے۔ بزم قانون جامعہ عثمانیہ کی جانب سے مرتب کردہ اس کتاب میں تاریخی استدلال واضح ہے۔ اس کے علاوہ یہ کوشش بھی کی گئی ہے کہ یونیورسٹی میں قانون کے شعبہ کے قیام اور اس شعبہ کے تحت تعلیم کے آغاز کے ساتھ ساتھ مختلف عہدوں میں ڈگری یافتگان اور نامور وکلاء کے بارے میں تفصیل درج کی جائے۔ درحقیقت اس تذکرے سے مختلف سنین میں قانون کی ڈگری لینے والوں کی تفصیل اور ان کی عوام میں

---

[۱] تذکرہ شعبہ قانون مرتبہ عثمانیہ یونیورسٹی بزم قانون مطبوعہ حیدرآباد ۱۹۴۲ء

مقبول پریکٹس کے بارے میں معلومات ملتی ہیں۔ بزم قانون نے ان ہونہار وکلاء کی تعلیمی زندگی کا خاکہ پیش کیا ہے جو سند یافتگی کے بعد ریاست حیدرآباد اور ملک کے نامور ماہر قانون اور منصف قرار دیئے گئے۔

جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد سے شعبۂ قانون کی ترقی اور اس شعبہ سے وابستہ اساتذہ اور طلباء کے کارنامے اور ان کی مصروفیات کو درج کرتے ہوئے اس تذکرے میں حیدرآباد کے ڈگری یافتہ قانون کے زمانہ طالب علمی کے حالات درج کیے گئے ہیں۔ درحقیقت یہ تذکرہ ایک رپورٹ کی شکل رکھتا ہے۔ جس میں ہر سنہ میں سند یافتہ طلباء کی تفصیل ان کی کامیابی کے درجہ کے بارے میں وضاحت کی گئی ہے۔ اس تذکرہ کو تاریخ ادارہ کے صیغہ میں اس لیے شمار کیا جاتا ہے کہ توسط سے شعبۂ قانون کی تفصیلات کا علم ہوتا ہے۔

تذکرہ بطور ذخیرۂ معلومات :

دکن میں تحریر کردہ تذکروں کے جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرزمین کے تذکرہ نویسوں نے فنِ تذکرہ کو ایک فعال صنف کے درجہ دینے کی کوشش کی جس کا نتیجہ یہ رہا کہ دکن میں تحریر کردہ تمام تذکرے متعدد فنون اور انداز واظہار کے نمائندہ ہوگئے ابتدائی طور پر چند تذکرے دکنی زبان میں لکھے گئے۔ لیکن رفتہ رفتہ دکنی زبان اور لب ولہجہ میں فرق پیدا ہوا اور تذکرے عام ادبی زبان میں لکھے جانے لگے۔ دکن کے تذکرہ نویسوں کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ انھوں نے اس فن کو سیماب صفت حیثیت دینے کی کوشش کی اور تذکرے کو طرح طرح کے انداز سے وابستہ کر دیا چنانچہ دکن میں ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ دکنی تذکرہ نویسوں نے تذکرے کو ذخیرۂ معلومات کی حیثیت دے دی۔ اس خصوصیت کے حامل تذکروں کی فہرست میں محمود صمدانی

کی کتاب "تذکرہ طاعون" کو ادبی طور پر بیماری کے بارے میں معلومات فراہم کرنے والی دکنی تصنیف کا درجہ دیا جاسکتا ہے۔

محمود صمدانی نے "تذکرۂ طاعون" سلہ میں مختلف طبی معلومات کے ذریعہ مرض طاعون کی ابتداء، اس کے تدارک کے لیے انتظامات اور مرض سے نجات کے بارے میں تفصیلات درج کی ہیں۔ اس تذکرے کو طبی کتاب کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ تذکرہ نگار نے بنیادی طور پر اس کتاب کو ہندوستانی ماحول میں لکھا اور کسی قدر مرض طاعون کے بارے میں معلومات فراہم کرکے انہیں کتابی شکل دے دی۔ اس کتاب میں مرض طاعون کے بارے میں چیدہ چیدہ معلومات کو جزوی طور پر تحریر کردیا گیا ہے۔ مواد کے اعتبار سے کتاب کو تذکرے کی سرشت میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ اس تذکرے میں شخصی تذکرے کا عکس نہیں ملتا اور نہ ہی مرضِ طاعون کی تاریخ میں اس تذکرے میں پیش کی گئی ہے بلکہ مرض کی شروعات اور اس کی روک تھام کے بارے میں معلومات اکٹھا کی گئی ہیں۔ اس لیے اس کی حیثیت کسی قدر معلوماتی کتاب کی ہوجاتی ہے مرضِ طاعون کے بارے میں اس تذکرہ سے مکمل متن دستیاب نہیں ہوتا چونکہ تذکرے کی خصوصیت ہوتی ہے کہ اس صنف میں صاحب شخصیت کے بارے میں چند اہم معلومات کو اکٹھا کردیا جاتا ہے اور اس فن میں تحقیقاتی متن نہیں ہوتا اور یہی انداز تذکرہ طاعون میں اختیار کیا گیا ہے۔ چند معلومات کو اکٹھا کرکے طاعون کے بارے میں اہم مواد فراہم کردیا گیا ہے اس لیے اس تذکرہ کو فنی اعتبار سے معلومات فراہم کرنے والے تذکرے کا درجہ دیا جاتا ہے۔

دکنی تذکروں میں یہ امتیازی خصوصیت پائی جاتی ہے کہ شمالی ہند کے مقابلہ میں یہاں کے ادیبوں اور شاعروں نے اس فن کو جامع ترین ہیئت کے طور پر استعمال کیا اور تذکرے کی معنویت کو اس حد تک ہمہ گیر بنادیا کہ اس کی حیثیت ایک سیال صنفِ سخن کی ہوگئی۔

تذکرہ بطورِ تاریخ عمارت :

عمارتوں کی تاریخ لکھنے کی روایت کو بطور تذکرہ پیش کرنے کا انداز بھی دکن میں فروغ پاتا رہا۔ دکنی تذکرہ نویسوں نے فن تذکرے کو صرف شخصیات اور سیرت کی حد تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس فن کو وسعت دیتے ہوئے عمارتوں کی تاریخ تحریر کرنے کے لیے بھی استعمال کیا اس خصوص میں تحقیق کے دوران سالار جنگ میوزیم لائبریری کے قلمی کتب خانہ میں ایک مخطوطہ دستیاب ہوا ہے جو تاریخ کے شعبہ میں ۵۱۱ نمبر پر محفوظ ہے "آثار الاوثان"[1] کے زیر عنوان سید محمد محی الدین خاں نے ایسی تاریخی عمارتوں کی تفصیل پیش کی جو مذہبی طور پر اہمیت کی حامل ہے۔ چنانچہ اس کتاب کو انھوں نے معابد مقدسہ اہلِ ہنود کا نام بھی دیا ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے ان تمام مورتیوں کا تذکرہ کیا ہے جو پہاڑوں میں پتھر کو تراش کر بنائی گئی ہیں۔ درحقیقت یہ قلمی کتاب بت پرستی پر اعتقاد رکھنے والے افراد کے لیے یہ معلومات فراہم کرتی ہے کہ پہاڑوں پر کس طرح صناعی کے ساتھ عمارتیں تعمیر کی گئیں اور ان میں دیوی اور دیوتاؤں کے بت بنائے گئے۔ سید محمد محی الدین خاں نے "آثار الاوثان" میں ابتدائی طور پر کوہستانی دیولوں کے بانیوں کا ذکر کرتے ہوئے ہر فرقہ کے مندروں کی علامات اور ان کی تعداد کے بارے میں تفصیلات درج کی ہیں درحقیقت مندر کا شمار ایک مذہبی عمارت کی حیثیت سے کیا جاتا ہے۔ اسی لیے اس کتاب کو تاریخ عمارت کے صیغہ میں شمار کیا جاتا ہے۔

"تذکرہ آثار الاوثان" مندروں کی عمارات اور دیوی اور دیوتاؤں کے حالات کی نمائندگی کرتا ہے مصنف نے پچھتر[75] مورتیوں کے نام اور ان کے حالات قلمبند کرنے کے

---

[1] آثار الاوثان (قلمی نسخہ) سالار جنگ میوزیم لائبریری حیدر آباد

بعد اورنگ آباد کے پہاڑی مندروں کی عمارتوں اور ایلورہ اور اجنٹہ کے غاروں میں تراشیدہ مورتیوں کی تفصیل پیش کی ہے۔ ابتدائی طور پر کتاب کا آغاز مقدمہ سے کیا گیا ہے۔ پوری کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر باب میں پہاڑیوں پر آباد مندروں کی عمارت اور بتوں کے بارے میں مختصر سی تفصیل درج کی گئی ہے ایلورہ کے تمام ۱۶ غاروں کا تذکرہ موجود ہے۔ جس کے ساتھ ہی اجنٹا کے ۲۹ غاروں کے بارے میں تفصیلات درج کرتے ہوئے بیدڑ، مومن آباد، کروسہ، مدراس، بجواڑہ، مہاولی پورہ، برابار، راجگڑھ، سیتا مڑہی، انفنٹہ، ناسک، کٹک، کاٹھیاواڑ اور راجپوتانہ کے مختلف غاروں اور دیولوں کی عمارتوں کے بارے میں اس تذکرے میں معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اردو ادب میں غالباً یہ پہلا تذکرہ ہے جس میں عمارتوں کی تاریخ کو درج کرنے کے لیے مندروں کا انتخاب کیا گیا ہے۔ مصنف نے "در عجائبات جہان ہندوستان" کے زیر عنوان تشریح کر دی ہے کہ درحقیقت ہندوستان کے پہاڑی علاقوں میں جو عجیب و غریب مندروں کی عمارتیں تعمیر کی گئی ہیں وہ اپنے دور کی یادگار ہیں۔ اگرچہ اس کتاب میں تاریخی عنصر شامل ہے۔ لیکن اس قلمی نسخے کو تاریخ میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ سید محی الدین نے اس کتاب میں تاریخی شواہد اور ٹھوس ثبوت سے کام نہیں لیا بلکہ جس طرح اردو تذکروں میں عامیانہ انداز اختیار کیا جاتا ہے۔ اس طرح اس کتاب میں پہاڑوں پر تعمیر شدہ مندروں کا تذکرہ کیا ہے۔ سید محی الدین خاں اورنگ آباد عدالت کے ناظم صدر کے عہدے پر فائز تھے اس کتاب کی تحریر کا منشا یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنی تحریر کے ذریعہ اردو داں طبقہ تک پہاڑیوں پر آباد مندروں کی عمارات اور ان میں موجود مورتیوں کے بارے میں معلومات پہنچانا چاہتے ہیں۔ یہ کتاب قلمی نسخے کی حالت میں خوشخط نستعلیق طرز تحریر کا بہترین نمونہ ہے جو ۱۳۱۱ھ میں تصنیف کی گئی اور اسی دور میں کتابت بھی کی گئی "آثار الاوثان" مجموعی اعتبار سے دیولوں کی

عمارتوں کا ایک بہترین تذکرہ ہے جس میں کسی قدر تاریخی عکس بھی شامل ہے چونکہ دیول یا مندر کا شمار بھی ایک عمارت میں کیا جاتا ہے اور ایلورہ اور اجنتا کے غاروں کی تراشش کا مقصد بھی مورتیوں میں ایستادہ کرنا تھا اسی لیے اس کتاب کو تاریخ عمارت کا درجہ دیا جائیگا اور اس کتاب میں محفوظ متن تذکرے کے انداز کو پیش کرتا ہے۔ اسی لیے "آثارالاوثان" کو دکن میں تحریر کردہ تذکرے کی حیثیت دی جاتی ہے۔

تذکرہ بطورِ شجرہ:

دکن میں تحریر کردہ تذکروں کی یہ ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہاں کے ادیبوں نے فن کو ہمیشہ جیتا جاگتا رکھنے کے لیے جدید تقاضوں سے منسلک رکھا جس کی مثال دکنی تذکروں سے دی جا سکتی ہے۔ عموماً کوئی صنف ادب جب جدید تقاضوں کی پابجائی سے غیر محرم ہو جاتی ہے تو لازمی طور پر ادب میں اس کا شمار کلاسیکی طرز میں کر دیا جاتا ہے۔ دکنی تذکروں کے مطالعہ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہوتی ہے کہ دکن کے ادیبوں نے اس صنف کو جدید ادب سے وابستہ کرنے کیلیے نئے نئے تجربے کیے اور اسے ہر آہنگ سے وابستہ رکھنے کی کوشش کی۔ چنانچہ قدیم دور میں تذکرے کا مفہوم جو کلاسیکی طرز سے وابستہ تھا اس روایت کو توڑنے کا حق دکنی تذکرہ نویسوں نے انجام دیا اور فن تذکرہ کو ایک متحرک صنف ادب قرار دینے کی کوشش کی جس کی بہترین مثال تذکرہ کو بطور شجرہ استعمال کرنے سے دی جا سکتی ہے۔ کئی کتابیں مطبوعہ حالت میں دیکھی گئی جن میں تذکرہ کی روایت کو شجرہ کے طور پر پیش کرنے کا ثبوت ملتا ہے لیکن یہاں پر صرف مخطوطات سے بحث کی جاتی ہے۔ مطبوعہ تذکرے کی فہرست میں "تذکرۂ قادریہ"[1] اور تذکرہ اولیاء

---

[1] تذکرۂ قادریہ از: محمد عبدالقادر مطبوعہ حیدرآباد دکن ۱۲۸۶ھ

ابوالعلائیہ"[1] میں تذکرے کو بطور شجرہ پیش کرنے کا مواد ملتا ہے۔ اسی طرح قلمی نسخوں میں شجرۃ المحمود[2] اور "شجرۃ الانصاب"[3] اور سلسلہ مشائخ طریقت[4] بھی تذکرے کو بطور شجرہ استعمال کرنے کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔

"شجرۃ المحمود" محمد منیر الدین چشتی محمودی کا تحریر کردہ مخطوطہ ہے جو اسٹیٹ سنٹرل لائبریری کے شعبۂ مخطوطات میں محفوظ ہے۔ فہرست میں اسے مجامع ۷۵۴ کا درجہ دیا گیا ہے۔ اس کی سن تالیف ۱۳۰۳ھ درج کی گئی ہے۔ درحقیقت یہ تذکرہ سلسلہ چشتیہ کے بزرگان دین کے حالات اور کرامات کے علاوہ ان کے شجرہ کی تفصیل پیش کرتا ہے۔ سلسلہ چشتیہ سے وابستہ ۱۹۵ بزرگان دین کے سلسلے کو ظاہر کرتے ہوئے محمد منیر الدین نے اس تصنیف کا آغاز حضرت علی سے کیا ہے اور اختتام اپنے مرشد شیخ محمود میاں کے والد کے حالات درج کرکے شجرہ کی تفصیل بھی پیش کی ہے۔ محمد منیر الدین حیدرآباد کے متوطن صوفی اور شاعر تھے منیر تخلص اور شیخ محمود میاں گجراتی کے مرید اور خلیفہ تھے۔ اس کتاب کے ذریعہ انھوں نے تذکرے کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے جدت سے کام لیا ہے اور شجرہ نویسی کو تذکرہ کے فن میں شامل کر دیا ہے۔ اس مخطوطہ کی خصوصیت یہی ہے کہ اس کی وجہ سے دکن میں تحریر کردہ تذکروں میں اس مخطوطہ کو اہمیت کے ساتھ شامل کیا جاتا ہے تذکرے کی صنف میں حسب نسب کو بطور تذکرہ پیش کرنے والے مصنف

---

[1] تذکرۃ الاولیاء ابوالعلائیہ۔ از میر کاظم علی خاں مطبوعہ حیدرآباد ۱۳۷۲ھ

[2] شجرۃ المحمود (قلمی) از محمد منیر الدین چشتی محمودی۔ تصنیف ۱۳۰۳ھ

[3] شجرۃ الانساب از۔ گردھاری پرشاد باقی (قلمی)

[4] سلسلۂ مشائخ طریقت۔ از فدا علی درویش (قلمی)

گردھاری پرشاد باقی ہیں جن کا تذکرہ "شجرۃ الانساب" دکنی تذکروں میں ایک اہم مخطوطہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ تذکرہ اسٹیٹ سنٹرل لائبریری کے شعبۂ مخطوطات میں ۳۰۷ تذکرے میں درج ہے۔ گردھاری پرشاد حیدرآباد کے متوطن تھے اور ان کا تخلص باقی تھا۔ گردھاری پرشاد کے اس مخطوطہ میں "علم الانساب" کا انداز غالب ہے۔ لیکن یہ مخطوطہ تذکرے کے ضمن میں شامل کیا جاتا ہے۔ گردھاری پرشاد نے اس تذکرے کو شجرہ کی تفصیل کی طرح نسب کی وضاحت کرتے ہوئے اپنی اس تصنیف میں کسی قدر تاریخی استدلال کے ذریعہ بتایا ہے کہ علم الانساب کی تاریخ کب سے شروع ہوئی اور نسب جانچنے کا طریقہ اقوام میں کب سے رائج ہوا۔ اگرچہ اس تصنیف میں تاریخی استدلال موجود ہے لیکن اس کا شمار تذکرے میں کیا جاتا ہے۔ متن اور مواد کی ترتیب میں تذکرے کا فن جن بے اعتدالیوں سے وابستہ رہتا ہے وہ عکس علم الانساب میں پوری طرح اُجاگر ہے۔ اسی لیے اس تصنیف کو تذکرے کا درجہ دیا گیا ہے۔ دکنی تذکروں میں ایک منفرد فنی خصوصیت اور ہیئتی اعتبار سے علٰحدہ طرز کی نمائندگی گردھاری پرشاد کے ان تذکرے میں واضح طور پر محسوس کی جا سکتی ہے۔

دکنی مخطوطات کی فہرست میں فدا علی درویش کا ایک ایسا قلمی نسخہ بھی دریافت ہوا ہے جو تذکرے کو شجرہ کے طور پر استعمال کرنے کی دلیل پیش کرتا ہے۔ "سلسلۂ مشائخ طریقت" ایک ایسا مخطوطہ ہے جس میں فدا علی درویش نے مختلف مشائخین کے سلسلۂ طریقت کو تذکرے کے روپ میں پیش کیا ہے۔ اگرچہ اس قلمی نسخہ کا شمار تذکرے میں ہوتا ہے لیکن شجرہ پیش کرنے کی خصوصیات اس تصنیف میں موجود ہیں۔ یہ تذکرہ عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری کے شعبۂ مخطوطات میں قلمی (۲۷۰) پر درج ہے۔ فدا علی درویش حیدرآباد کے متوطن تھے جس میں تفصیلی طور پر مختلف مشائخین کے سلسلۂ طریقت کو پیش کیا گیا۔ چونکہ یہ تذکرہ دکن میں تحریر کیا گیا اسی لیے اس کا شمار دکنی تذکروں میں پیش کیا جاتا ہے۔ پیر، پیغمبر اور

اولیائے کرام کے علاوہ مشائخین سے اکتساب فیض اور بیعت کے طریقے سے متعلق حالات اور واقعات کو بطور تذکرہ پیش کرنے کی جدت سب سے پہلے فدا علی درویش نے کی اس تذکرے کے ذریعہ مشائخین کے خانقاہی نظام اور بیعت کرنے کی تاریخ کو تذکرہ کے انداز میں پیش کیا ہے۔ اس لحاظ سے دکنی تذکروں میں اس تصنیف کی حیثیت ایک منفرد تذکرہ کی ہو جاتی ہے جو شجرہ کے ساتھ ساتھ بیعت کی تاریخ بھی پیش کرتا ہے۔ جس سے ثبوت ملتا ہے کہ دکنی تذکرے متعدد طرز اسلوب سے وابستہ رہے ہے۔

تذکرہ بطورِ خطبہ و خطابات:

عام طور پر خطبات سے مراد ذی حیثیت افراد کے وہ الفاظ ہیں جو معنوی حیثیت سے جامع ہونے کے علاوہ اپنے اندر کشش بھی رکھتے ہیں۔ امیر و امراء، بادشاہ و سلاطین اور پیر طریقت کی جانب سے عطا کردہ وہ علمی کام جو صاحب شخصیت کی خصوصیت اور اس کی فطرت کی غمازی کرے وہ خطبات کہلاتا ہے جو نہ صرف انسان کی شخصیت کو قدآور بناتا ہے بلکہ انہی خطبات کی وجہ سے انسان کو سماج میں بلند مقام بھی ملتا ہے۔ خطبات کی حیثیت صرف صوری نہیں ہوتی بلکہ اس کے ذریعہ خطبہ دینے والوں کی زباندانی کا پتہ چلتا ہے۔ چونکہ جنوبی ہند میں بھی مختلف علماء و صوفیا موجود تھے۔ اس لیے دکن میں خطبات کو فروغ دینے کا سلسلہ جاری رہا۔ جس کے نتیجہ میں تذکرہ کو بطور خطبات رواج دینے کا سلسلہ شروع ہوا دکنی تذکرہ نویسوں نے خطبوں کی تاریخ مرتب کرنے کا ایک نیا طریقہ اپنایا۔ اس کے ذریعہ نہ صرف خطبات کی تاریخ مدون کرنے کی کوشش کی گئی بلکہ علماء اور فضلاء نے مختلف مذہبی جلسوں سے خطاب کرتے ہوئے جو خطبے دیئے ان کی بھی تفصیل پیش کی گئی۔ دکنی تذکروں کے مخطوطات کی طویل فہرست میں "تذکرہ خطابات" اور "کشکول" ایسی تصانیف ہیں جس میں خطبات کی تفصیل درج ہے۔

"تذکرۃ الخطابیہ"[1] دکنی تذکروں میں اہمیت کا حامل تذکرہ ہے جسے محمد عثمان عمادی نے لکھا ہے اس تذکرے کے ذریعہ پیغمبر اسلام، حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عثمان غنی، حضرت عبداللہ بن زبیر، حضرت علی، حضرت طارق بن زیاد حضرت عمر بن عبدالعزیز اور شیخ عبدالقادر عمادی کے خطبوں کو تالیف کی شکل میں پیش کیا گیا ہے درحقیقت اس تذکرہ کو خطیبوں کے تذکروں میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ محمد عثمان عمادی نے اس تذکرے میں اسلام کے نامور اشخاص کے خطبات کو یکجا کر کے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ درحقیقت حرّیت کی روح خطبات کے ذریعہ مسلمانوں میں پھیلتی گئی۔ دکنی تذکروں میں اس تالیف کی حیثیت منفرد سمجھی جاتی ہے اور اس امر کی بھی وضاحت ہوتی ہے کہ دکنی تذکرہ نویسوں کی جدت طبع نے اس فن کو مختلف حیثیات سے فروغ دینے کی کوشش کی ہے، محمد عثمان عمادی کا یہ تذکرہ دکنی تذکروں میں اس وجہ سے علحدہ مقام رکھتا ہے کہ اس کے ذریعہ مؤلف نے تذکرہ کی روایت میں جدت کی بنیاد قائم کی اور فن کو شخصی تذکرہ سے علحدہ کر کے خطبات کے تذکرہ سے مربوط کر دیا۔

دکنی تذکروں کی فہرست میں "کشکول"[2] بھی اپنی علحدہ حیثیت رکھتا ہے۔ فریدالدین خاں خوشگی نے اس تذکرہ میں ابتدائی طور پر وجود انسان اور سترہ علوم سے بحث کرتے ہوئے پانچ ابواب کے بعد مختلف فرقوں سے تعلق رکھنے والے افراد کو خطابات سے نوازا ہے۔ چنانچہ وہ بزرگوں اور حکمائے متقدمین کی درجہ بندی کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

۱۔ فرقہ اول : حکمائے متصوفین
۲۔ فرقہ دوم : حکمائے متکلمین } نبوت و رسالت کے قائل۔ طابع احکام۔

---

[1] تذکرۃ الخطابیہ۔ مطبوعہ۔ از محمد عثمان عمادی ۱۹۳۵ء

[2] کشکول۔ مخطوطہ سالار جنگ میوزیم لائبریری از فریدالدین خان خوشگی۔

۳۔ فرقہ سوم :۔ علمائے اشراقین } تابع عقل اور نیچر پرست
۴۔ فرقہ چہارم :۔ حکمائے مشائین

اس تذکرہ کے ذریعہ فرید الدین خاں خویشگی نے مفکرین کے درجے متعین کرکے انہیں مختلف خطابات سے نوازا ہے۔ اور مذہبی احکام کی بجاآوری اور مذہبیت کے قائل علماء کو متصوفین اور متکلمین کے خطابوں سے نوازنا۔ جبکہ خدا اور رسول کے وجود سے انکار کرنے والے علماء کو اشراقین اور مشائین کے خطابات دیئے اس طرح فرید الدین خاں خویشگی کا یہ تذکرہ مذہبی اور غیر مذہبی حکمائے عالم کو چار مختلف خطابوں سے معنون کرتا ہے۔ اسی لیے دکنی تذکروں میں کشکول کو خطابات کے تذکرے کی حیثیت دی جاتی ہے اگرچہ اس تذکرہ میں بادشاہوں کی جانب سے عطا کردہ خطابات کا ذکر نہیں ہے لیکن حکمائے عالم کو مختلف درجوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اسی لیے یہ تذکرہ خطابات کے صیغہ میں شمار کیا جائے گا۔

تذکرہ بطورِ سیرت:

سوانح اور سیرت میں تھوڑا سا فرق پایا جاتا ہے۔ عام طور پر زندگی کے حالات تحریر کرنے کو سوانح کا درجہ حاصل ہے۔ سیرت سوانح سے اعلیٰ معیار کی متقاضی ہوتی ہے۔ عموماً سیرت نگاری کے دوران شخصیت سے زیادہ کارناموں کی تفصیل پر توجہ دی جاتی ہے جس کے نتیجہ میں سیرت نگاری کے دوران شخصیت سے زیادہ کارناموں کی تفصیل پر توجہ دی جاتی ہے جس کے نتیجہ میں سیرت نگاری شخصی واقعات کا پلندہ نہیں بنتی بلکہ کارناموں کے بیان کا بہترین ذریعہ بن جاتی ہے۔ سیرت نگاری کے دوران سوانحی عکس کو بھی شامل کیا جاتا ہے۔ لیکن سیرت کی خصوصیت یہی ہے کہ اس کے توسط سے انسان کے روحانی ارتقاء اور اس کے خصائل سے بحث کی جاتی ہے۔

جبکہ سوانح نگاری میں صرف شخصیت اور کارناموں کی تاریخ درج ہوتی ہے اس اعتبار سے سیرت نگاری نہ صرف انسان کے باطنی اطوار کی تصویر کشی کرتی ہے بلکہ روحانی طاقتوں سے دل کو مسحور کرنے کی صلاحیت کے بارے میں بھی معلومات فراہم کرتی ہے۔ دکنی تذکرہ نویسوں نے فن تذکرہ کو سیرت کے طور پر بھی استعمال کیا۔ سوانح تحریر کرنے کا تصور عام طور پر دکن میں تذکرے سے وابستہ رہا۔ جس کے ساتھ ہی مذہبی علماء کی سیرت کو بطور تذکرہ پیش کرنے کی روایت بھی عام ہوگئی۔ دکنی مخطوطات میں کئی ایسی تصانیف دیکھنے میں آئی ہیں جن کا مقصد علوم باطنی سے آشنا مذہبی علماء کی سیرت تحریر کرتا رہا۔ مطبوعہ کتابوں میں "تذکرہ تاج الاولیاء"[1] اس کے علاوہ "تذکرۂ حسن"[2] "تذکرہ حسین"[3] "تذکرۂ حضرت جلال الدین"[4] "تذکرۂ حمید الدین ناگوری"[5] "تذکرہ خواجہ عبداللہ خاں"[6] "تذکرۂ سادات"[7] "تذکرہ سعید"[8]

---

[1] تذکرہ تاج الاولیاء۔ از محمد حسام الدین مطبوعہ حیدرآباد۔

[2] ۔ تذکرۂ حسن از محمد حسام الدین فاضل مطبوعہ حیدرآباد دکن ۱۳۵۳ھ

[3] تذکرۂ حسین از " " "

[4] تذکرہ حضرت جلال الدین از سخاوت مرزا مطبوعہ حیدرآباد دکن ۱۹۶۲ء

[5] تذکرۂ حمید الدین ناگوری۔ از ریاضت علی چشتی مطبوعہ حیدرآباد ۱۹۶۶ء

[6] تذکرہ خواجہ عبداللہ خاں۔ از سید محمد اکرام الدین خاں۔ مطبوعہ حیدرآباد دکن ۱۳۶۲ھ

[7] تذکرۂ سادات۔ از ناصر الدین علی قادری۔ مطبوعہ حیدرآباد دکن

[8] تذکرہ سعید از محمد افضل اقبال مطبوعہ حیدرآباد ۱۹۷۳ء

"تذکرۂ علی[51]"، "تذکرۂ غوث دکن"[52]، "تذکرۂ مخدوم زادہ"[53] کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ دکنی تذکرہ نویسوں نے سیرت نگاری میں مکمل کامیابی حاصل کی۔

دکن کے تذکرہ نویس مذہبی طور پر علماء اور مشائخین سے گہری وابستگی رکھتے تھے جس کے نتیجہ میں تذکرہ کی مکمل روایت سیرت نگاری سے معمور ہو گئی۔ تذکرۂ حسین اور تذکرۂ علی جیسے دکنی تذکروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور میں دکنی تذکرہ نویسوں نے مختلف عالموں اور اولیائے کرام کی خدمات کو سیرت کے روپ میں پیش کرنے کی کوشش کی جس کے نتیجہ میں ان کی تصانیف تذکرہ کے روایت کی حامل ہو گئیں اولیائے کرام اور علماء کی مبسوط سوانح لکھنے کو لیے تذکرہ کی ذیل میں شامل کیا جاتا ہے کہ جس طرح دورِ قدیم میں اردو شاعروں کے بارے میں تذکرہ تحریر کرتے ہوئے تذکرہ نویس مختصر سوانح بیان کرنے کو ضروری خیال کرتے تھے اور پھر ان کا کلام درج کیا جاتا تھا۔ اسی طرح دکن کی مذہبی تصانیف میں بھی ابتداء میں اولیائے کرام یا علماء کی مختصر سوانح درج کی جاتی ہے اور پھر ان کے روحانی کمالات کا ذکر کیا جاتا ہے اسی لیے ان تصانیف کو تذکرہ کی سرشت میں شامل کرتے ہوئے انہیں سیرت کا درجہ دیا جاتا ہے کیونکہ ان کتابوں میں روحانیات اور اخلاقی کردار کو نمایاں طور پر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اخلاقیات اور روحانیات کو جس سوانح میں شامل کیا جاتا ہے وہ حقیقی طور پر سیرت نگاری کی کتابوں میں شامل کی جاتی ہیں۔ دکن کے اکثر تذکروں میں مذہبی رنگ کے ساتھ ساتھ روحانیات کا عکس بھی شامل ہے۔

---

[51] تذکرۂ علی از: محمد حسام الدین فاضل حیدرآباد دکن ۱۳۵۶ھ

[52] تذکرہ غوثِ دکن از محمد تاج الدین۔ مطبوعہ حیدرآباد دکن

[53] تذکرہ مخدوم زادہ از عظمت اللہ حسینی زیدی۔ مطبوعہ حیدرآباد دکن

ہے۔ اس انداز کے تذکروں میں دکنی ادبیات کا یہ طویل سلسلہ ملتا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تذکرہ کو بطورِ سیرت پیش کرنے کا ذوق دکن میں کافی حد تک پروان چڑھ چکا تھا۔

تذکرہ بطورِ شخصی سوانح:

شخصی کارناموں کو پیش کرتے ہوئے صاحبِ شخصیت کے کردار کو ابھارنے کے لیے لکھے جانے والے تذکرے شخصی سوانح کی ضمن میں آتے ہیں۔ عام طور پر اس قسم کے تذکروں میں مذہبی یا ادبی شخصیت کو زیرِ بحث نہیں لایا جاتا بلکہ اپنے کردار اور عمل سے متاثر کرنے والے افراد کے تذکرہ کو شخصی سوانح کی تعریف میں شامل کیا جاتا ہے۔ شخصی سوانح اگرچہ کہ مذہبی اور ادبی حیثیات سے اہمیت رکھنے والے افراد سے متعلق نہیں ہوتی۔ لیکن اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ اس طریقۂ تذکرہ میں کارناموں کی اہمیت کے اعتبار سے شخصیت کو ابھارا جاتا ہے۔ یعنی شخصی سوانح کا تعلق علم تاریخ سے نہیں ہوتا بلکہ فلاحی، تعلیمی، طبّی اور ثقافتی خدمات انجام دینے والے افراد کے کارناموں کو ضبط تحریر میں لانا شخصی سوانح کی ذیل میں شامل ہے۔ دکن میں ایسے متعدد تذکرے تحریر کیے گئے۔ جن میں شخصی سوانح کا عکس غالب ہے۔

تذکرے کی خصوصیت میں شخصیت کے اظہار کو بہت بڑا دخل ہوتا ہے جبکہ سوانح صرف ایک ہی شخصیت کے کارناموں کے اظہار پر مبنی ہوتی ہے۔ دکن میں تحریر کردہ بعض تذکروں کو شخصی سوانح کے طور پر اس لیے قبول کیا جاسکتا ہے کہ اگرچہ ان تذکروں میں شخصیت کا عکس غالب ہے لیکن تذکرہ نویسوں نے سوانحی اعتبار سے شخصیت کے کارناموں کو نمایاں حیثیت دی ہے۔ اس قسم کے تذکروں میں سیاسی، مذہبی اور سماجی شخصیات کو شامل نہیں کیا گیا بلکہ ایسے افراد کی سوانح کو ہی اس ضمن میں شمار کیا گیا ہے جو اپنی تعلیمی، فلاحی اور ثقافتی خدمات کی وجہ سے مشہور تھے۔ اس قسم کے

تذکرے چونکہ شخصی خدمات کے بارے میں مواد فراہم کرتے ہیں اسی لیے ان کا شمار تذکرہ کی ایک شکل شخصی سوانح میں کیا جاتا ہے۔ دکن میں اس قسم کے تذکروں کا طویل سلسلہ ہے۔

دکنی نثر دورِ قدیم سے عہد حاضر تک تذکرے کے فن کو اپنائے ہوئے ہے بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آج کے دور میں بھی کسی اہم شخصیت کی سوانح لکھنے کے بعد مصنف کتاب کے عنوان کو تذکرہ کی سرخی سے نوازنے کو فخر کا درجہ محسوس کرتا ہے۔ دکنی تذکرہ نویسوں نے سوانح کے بیان کے دوران تذکرہ کی روایتی صنف کو برقرار رکھتے ہوئے شخصی سوانح پیش کرنے میں دکنی تذکرہ نگاروں کا اسلوب اور انداز بذاتِ خود منفرد نہیں ہے۔ لیکن اس طرز میں سوانحی نقوش واضح ہوتے ہیں۔ دکن میں جن شخصیات کے تذکرے لکھے گئے انہیں تذکرہ بطور شخصی سوانح کا نام اس لیے دیا جاتا ہے کہ دکنی تذکرہ نویسوں نے ان تذکروں میں اسی فنی روایت کو برقرار رکھا ہے جو قدیم تذکروں میں مروج رہی۔ ادبی تذکروں میں کئی شعراء یا ادیبوں کے حالات یکجا کیے جاتے تھے۔ دکن کے تذکرہ نویسوں نے اسی طرز کو اپناتے ہوئے مختلف علوم و فنون میں ماہر افراد کے تذکرے تحریر کیے جو ادبی اور مذہبی تذکروں سے بالکل مختلف ہیں۔ ایسے تذکروں فہرست میں مخطوطات بھی شامل ہیں اور مطبوعات کا طویل سلسلہ بھی ہے۔

شخصی سوانح کو بطور تذکرہ پیش کرنے کی روایت دکن میں مرزا محمد علی کے مخطوطہ "تذکرۂ خوشنویساں" سے ہوتی ہے۔ یہ تذکرہ سالار جنگ میوزیم لائبریری کے شعبہ مخطوطات میں محفوظ ہے۔ ۱۳۲۲ھ میں تحریر کردہ یہ تذکرہ درحقیقت حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر دور جدید کے مشہور کتبہ نویس اور خوش نویسوں کے بارے میں مختصر سوانحی مواد پیش کرتا ہے۔ مرزا محمد علی نے خط کی قسمیں بیان کرتے ہوئے ان کے موجدین کی مختصر تاریخ بھی تحریر کر دی ہے ۱۴۷ صفحات پر مشتمل اس مخطوطہ میں کئی سو

خوش نویسوں کے بارے میں مختصر مواد فراہم کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ عرب۔ ایران اور ہندوستان میں رسم الخط کی روایت مختلف ذرائع سے ترقی پاتی رہی۔ اس تصنیف میں مرزا محمد علی نے ان کے عہد میں موجود حیدرآبادی خوشنویسوں کے بارے میں بھی مختصر جائزہ پیش کیا ہے۔ اس کتاب کو شخصی سوانح کا درجہ اس لیے دیا جا سکتا ہے کہ ادبی اور مذہبی شخصیتوں کے علاوہ فنی دستگاہ رکھنے والے افراد کا ذکر کرتے ہوئے اس کتاب میں تذکرے کی روایت کو برقرار رکھا گیا ہے۔ مرزا محمد علی حیدرآباد کے مشہور خطاط اور خوش نویس تھے۔ ان کا یہ مخطوطہ ثابت کرتا ہے کہ دکن میں تذکرے کی روایت کو صرف ادبی اور مذہبی شخصیات کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کی حد تک محدود نہیں رکھا گیا بلکہ تذکرہ نویسوں نے تذکرہ کو شخصی سوانح کے طور پر بھی استعمال کیا۔ تذکرہ کو شخصی سوانح کے طور پر استعمال کرنے کا رواج دکن میں پروان چڑھتا رہا اور کئی اہم شخصیات کی سوانح کو تذکرہ کی روایت پر تحریر کر کے اسے ایک مبسوط کتابی شکل دینے کا طریقہ دکنی تذکرہ نویسوں کے فنی مزاج کی نمائندگی کرتا ہے اور ساتھ ہی یہ ثبوت بھی ملتا ہے کہ دکن میں تذکرے کی روایت شخصی سوانح کے طور پر بھی ترقی پاتی رہی۔

تذکرہ بطور ادبی سوانح:

دورِ قدیم میں تذکرہ کی روایت قدیم اصولوں پر ترقی پاتی رہی۔ تحقیقی استدلال کی ترقی نے تذکرہ کی روایت میں تبدیلی پیدا کی اور متن کی فراہمی میں کسی قدر تحقیق کا انداز شامل ہونے لگا۔ دکنی تذکرہ نویسوں کے ادبی تذکرے بھی اسی

لہ تذکرۂ خوشنویساں از مرزا محمد علی (مخطوطہ) سالار جنگ میوزیم لائبریری حیدرآباد۔

استدلال سے استفادہ کرنے لگے۔ جس کے نتیجہ میں متن تو تحقیقی پیش کیا جانے لگا لیکن تذکرے کی جھلکیاں ان میں محسوس کی جانے لگیں۔ چنانچہ ایسے تذکرے جن میں تحقیقی مواد تو موجود ہو لیکن متن کے اعتبار سے تذکرہ نویسوں نے فن تذکرہ کی خصوصیت کو اپنایا ہو تو ایسے تذکرے ادبی سوانح کے نام سے یاد کیے جائیں گے۔ دکن کے تذکرہ نویسوں میں یہ امتیازی خصوصیت جاتی ہے کہ انھوں نے تذکرہ کو فنِ سوانح سے قریب لانے کی کوشش کی اور جس طرح تذکرے میں ایک سے زیادہ ادبی شخصیات کی سوانح درج کی جاتی تھی اسی طرح دکن میں کثیر تعداد میں ایسے تذکرے تحریر کیے گیے جنہیں متن کے اعتبار سے ادبی سوانح میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

چونکہ سوانح ایک ہی ذات اور شخصیت کے بارے میں مواد فراہم کرتی ہے۔ اور دکن میں ایسی کئی کتابیں لکھی گئیں جن میں کئی شخصیات کی سوانح پیش کی گئیں اور اسے تذکرے کا نام دیا گیا چونکہ یہ تذکرے سوانحی خصوصیات کی پوری طرح پابجائی نہیں کرتے اسی لیے انہیں تذکرہ بطور ادبی سوانح کا نام دیا جاتا ہے۔ ایسی کتابوں میں "تذکرۂ خواتینِ دکن"[1] "تذکرۂ یوروپین شعرائے اُردو"[2] "سخنورانِ بلند فکر"[3] شمار کی جاتی ہیں۔ کیونکہ کتابوں کے ذریعہ تذکرہ نویسوں نے سوانحی خدوخال ابھارنے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ تذکرۂ خواتین دکن میں تاریخی مواد پیش کیا گیا ہے اور یہ کتاب لاہور سے شائع ہوئی ہے۔ لیکن دکنی تذکروں میں شمار کرنے کی وجہ یہی ہے کہ سرزمین دکن کے سلطنتی کاروبار میں حصہ لینے والی ان خواتین کا ذکر اس کتاب میں کیا گیا ہے جن کی وجہ

۱؎ تذکرہ خواتین دکن از محمد الدین فوق مطبوعہ لاہور ۱۹۲۰ء

۲؎ تذکرۂ یوروپین شعرائے اردو۔ از محمد سردار علی۔ مطبوعہ رزاقی مشین پریس حیدرآباد ۱۹۴۲ء

۳؎ سخنورانِ بلند فکر۔ از محمد منور گوہر۔ مطبوعہ جے پریس مدراس ۱۹۳۶ء۔

سے دکن کی تاریخ میں خواتین کے کارناموں پر روشنی پڑتی ہے ۔ محمد الدین فوق نے اس کتاب کے ذریعہ خواتینِ دکن کا تذکرہ کر کے ثابت کر دیا کہ دکن میں بسنے والے صاحبِ فکر افراد کے تذکرے ہی ادبی حیثیت سے اہمیت نہیں رکھتے بلکہ خواتین دکن نے بھی ایسے کارنامے انجام دیے ہیں کہ جن پر تذکرے کی روایت کو قائم رکھتے ہوئے ایک مبسوط کتاب لکھی جا سکتی ہے

"تذکرۂ خواتینِ دکن" دکن کی تاریخ میں مشہور خواتین کے جنگی کارناموں سے معمور ہے۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں شائع شدہ اس کتاب کے مصنف رسالدار نظام کے ایڈیٹر تھے۔ انہوں نے مملکت سے وابستہ ہندو اور مسلمان دکنی خواتین کا ذکر کر کے اس کتاب کو کافی اہمیت دے دی ہے اور خونزہ ہمایوں، پونجی خاتون، چاند بی بی، پرتھال، بہرہ دیوی اور جلوی دیوی جیسی شخصیتوں کے انجام دیے گئے کارناموں کو سوانحی طور پر پیش کیا ہے۔ اسی لیے اس کتاب کا شمار تذکرہ بطور ادبی سوانح کیا جاتا ہے۔

ادبی شخصیتوں کی سوانح کو بطور تذکرہ پیش کرنے کی روایت دکن میں فنی طور پر ترقی پاتی رہی جس کی مثال "تذکرہ یوروپین شعرائے اُردو" سے کی جاتی ہے ۔ اس تذکرے میں محمد سردار علی نے ان انگریزوں کی مختصر سوانح اور کلام کا نمونہ پیش کیا ہے۔ جنہوں نے ہندوستان میں رہ کر اردو میں شاعری کی اور اپنے کلام کا نمونہ نہ صرف شائع کیا بلکہ ادب میں مقام بھی پیدا کیا۔ مؤلف نے تذکرہ کو ابجدی حروف میں ترتیب دیا ہے اور کل ۴۷ انگریز شعراء کی مختصر سوانح پیش کی ہے ۔ اس تذکرہ کا شمار ادبی سوانح میں اس لیے کیا جاتا ہے کہ تذکرہ نویس نے متن کے ذریعہ ادبی شاعروں کی سوانح پیش کی ہے ۔

سخنورانِ بلند فکر مدراس کے شاعروں کی مبسوط سوانح ہے ۔ جس میں محمد منور گوہر نے مدراس میں پیدا ہونے والے فارسی اور اُردو شعراء کے علاوہ ایسے شاعروں کے بارے میں بھی تفصیل پیش کی ہے جو مدراس کو اپنا وطن بنا کر وہیں بس گئے۔ یہ تذکرہ مکمل طور پر ادبی سوانح کی دلیل پیش کرتا ہے۔ تین ابواب پر مشتمل اس تذکرہ میں کسی قدر تحقیق

انداز روا رکھا گیا ہے۔ دکنی شعراء کی تفصیل بھی پیش کی گئی ہے۔ جملہ ۱۴۳ شعراء کی سوانح درج کر محمد منور گوہر نے اس کتاب کو جامع ترین ادبی سوانح کی حیثیت دے دی ہے ادبی سوانح کے طور پر پیش کردہ دیگر تذکروں میں "یادگار ضیغم" ؎۱ اور "تذکرہ جوھر فرد" ؎۲ کا شمار بھی کیا جاتا ہے۔ عبداللہ خاں نے "یادگار ضیغم" میں حروف تہجی کے اعتبار سے شعرائے اُردو کی سوانح ترتیب دی ہے۔ شاعروں کی طویل فہرست اور ان کی سوانح کے ساتھ ان کے منتخبہ کلام بھی اس کتاب میں شامل ہے۔ "تذکرۂ جوہر فرد" ملیح آباد کے شاعروں کا تذکرہ ہے۔ جسے حروفِ ابجد سے ترتیب نہیں دیا گیا ہے بلکہ مقدمہ میں مؤلف نے ملیح آباد پہنچنے کی تفصیل درج کی ہے۔ اس مخطوطہ میں مؤلف نے ملیح آباد پہنچنے کی تفصیل درج کی ہے۔ اس مخطوطہ میں مؤلف نے شاعروں کی سوانح نہیں لکھی بلکہ شاعر کا نام اور تخلص لکھ کر اس کا منتخبہ کلام پیش کر دیا ہے۔ اس تذکرہ کی حیثیت "بیاض" جیسی ہے لیکن اس وجہ سے اہمیت کا حامل ہے کہ ایک حیدرآبادی ادیب نے ملیح آباد کا سفر کر کے وہاں کے شعراء کا کلام لبطور نمونہ پیش کر دیا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دکنی تذکرہ نویسوں نے صرف دکن کی سرزمین سے وابستہ افراد کے تذکرے لکھے بلکہ ان ادیبوں اور شاعروں کے تذکرے پر بھی زور دیا جو دکن سے غیر متعلق تھے۔ "تذکرۂ جوہر فرد" اسی طرز کا ایک تذکرہ ہے جس میں ادبی شخصیتوں کے تذکرے کو پیش کرنے کے لیے صرف ان کے کلام کا سہارا لیا گیا ہے۔ مؤلف نے دیباچہ میں وضاحت کر دی ہے کہ حیدرآباد سے ملیح آباد پہنچنے کے بعد وہاں کے شعراء سے رابطہ کے نتیجہ میں یہ تذکرہ مرتب کیا گیا۔ مؤلف کے لیے یہ دشوار عمل تھا کہ مختصر سے قیام کے موقع پر ملیح آباد کے شاعروں کی

؎۱ یادگار ضیغم۔ از عبداللہ خاں ضیغم۔ مطبوعہ مطبع گلزار دکن حیدرآباد ۱۳۰۳ھ

؎۲ تذکرۂ جوہر فرد۔ از سید محمد علی ملیح آبادی (قلمی) عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری۔

سوانح جمع کی جاسکے اسی لیے مولف نے ایک یادگار کی حیثیت سے صرف شعرائے کے کلام کو یکجا کر دیا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دکنی تذکروں میں ادبی سوانح پیش کرنے کا اصول موجود ہے۔ اس طرح دکنی تذکرہ نویسوں نے ادیبوں اور شاعروں کی سوانح لکھتے وقت تذکرے کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے دکنی تذکروں کو ادبی سوانح کا درجہ دے دیا۔

تذکرہ بطور مذہبی سوانح :

تذکرہ کو سوانح سے ایک مختلف طرزِ نثر کا درجہ دیا جاتا ہے کیونکہ سوانح ابتداء سے آخر تک ایک ہی شخصیت کے بارے میں پیدائش سے لے کر وفات تک کے حالات درج کیے جاتے ہیں جبکہ تذکرہ میں ایک سے زیادہ اصحابِ کمال کے کارنامے سوانحی حالات کے ساتھ درج کیے جاتے ہیں۔ اسی امتیازی فرق کی وجہ سے تذکرہ اور سوانح میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

تذکرہ کو بطورِ مذہبی سوانح پیش کرنے سے مراد ایسی کتابوں کی پیشکشی ہوگی جن میں ایک سے زیادہ مذہبی شخصیتوں کی سوانح درج ہو۔ یعنی مذہبی علماء و اولیاء اور صوفیاء کے کارنامے کسی ایک کتاب میں درج کر دیئے جائیں تو اس کتاب کی حیثیت سوانح کی نہیں بلکہ تذکرہ کی ہو جائے گی۔ دکن میں ایسے متعدد تذکرے تحریر کیے گئے جو نہ صرف ایک سے زیادہ مذہبی علماء کی سوانح پیش کرتے ہیں بلکہ بعض دکنی تذکروں میں کئی سو علماء اور اولیاء کی سوانح بھی مرتب کر دی گئی ہے۔ اس قسم کے تذکروں میں "روضۃ الاقطاب"[1] "تذکرۂ اولیائے رائچور" کا شمار کیا جاتا ہے جن میں تذکرہ نویسوں نے دکن کے مختلف علماء کے بارے میں مختصر حالاتِ زندگی پیش کرتے ہوئے تذکرہ کی روایت کو برقرار رکھا ہے۔

---

[1] تذکرۂ روضۃ الاقطاب۔ از۔ رونق علی مطبوعہ دلگداز پریس لکھنو۔

روضۃ الاقطاب ایک ایسا تذکرہ ہے جس میں خلد آباد سے وابستہ مختلف علمائے کی مختصر سوانح درج کی گئی ہے۔ اگرچہ اس کتاب میں تحقیقی انداز روا نہیں رکھا گیا۔ لیکن کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولف نے فارسی کتابوں سے بطور خاص استفادہ کیا ہے جو کسی حد تک گوارا بھی ہے کیونکہ خلد آباد کے اولیائے کرام کے بارے میں مواد کی دستیابی صرف فارسی کتابوں سے ہی ممکن تھی۔ رونق علی نے اس کتاب کو اولیائے کرام کے تذکرہ کی حیثیت دے دی تواریخ اور سنین درج کرنے میں مؤلف سے بھول چوک ہوئی ہے۔ لیکن اردو میں ابتدائی نقوش کی حیثیت سے اُسے گوارا کیا جا سکتا ہے۔

دکن کے تذکرہ نویسوں میں تذکرہ کو بطور مذہبی سوانح پیش کرنے والے افراد میں قاری سید شاہ روشن علی کا شمار بھی ہوتا ہے جنہوں نے "تذکرۂ اولیائے رائچور"[1] لکھ کر دکنی تذکرہ کی روایت کو مذہبی سوانح سے مربوط کر دیا۔ رائچور کے علماء اور مشائخین کی زندگی اور حالات اور کیفیات کو سوانحی انداز میں پیش کرتے ہوئے اسی تذکرہ میں روشن علی نے تذکرہ روایت کو پوری طرح ملحوظ رکھا ہے اور ہر مذہبی شخصیت کے بارے مختصر سے مواد کے ذریعہ ان کی سوانح مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ مزید کئی کتابیں دکن میں اس مقصد کے حصول کے لیے لکھی گئیں جن میں "تذکرۃ الاولیاءؒ"[2] "قصص العلماء"[3] "تذکرۂ اولیائے دکن"[4] "احوال العارفین"[5] اور "تذکرۂ خاصان خدا"[6] کافی اہمیت

---

[1] تذکرۂ اولیائے رائچور۔ از۔ قاری سید شاہ روشن علی مطبوعہ رائچور ۱۳۱۵ھ

[2] تذکرۃ الاولیاء۔ از۔ شیخ فرید الدین مطبوعہ مدراس

[3] قصص العلماء۔ از۔ میر نادر علی رعد۔ مطبوعہ مطبع حیدری حیدرآباد

[4] تذکرہ اولیاء دکن۔ از عبد الجبار خاں ملکاپوری۔ حسن پرنٹس حیدرآباد ۱۹۰۱ء

[5] احوال العارفین۔ از۔ محمد نعیم مسکین شاہ۔ مطبوعہ مطبع فیض الکریم حیدرآباد ۱۳۱۱ھ

رکھتے ہیں جن میں تذکرہ کو بطور مذہبی سوانح پیش کرنے کا اثر غالب ہے۔

دکنی تذکروں میں شخصی ، ادبی سوانح کے مقابلہ میں مذہبی سوانح کو بطور تذکرہ پیش کرنے کا عکس بہت زیادہ غالب نظر آتا ہے۔ اس خصوص میں دکنی تذکرہ نگاروں نے تصانیف کا طویل سلسلہ شروع کیا جن میں مذہبی شخصیات اور علماء کی زندگی کے حالات کو مبسوط کتاب کی شکل میں پیش کرنے پر خصوصی توجہ دی گئی ایسی کتابوں میں "اخبار الصالحین"[1] "تذکرۃ الاولیاء"[2] "ترجمہ روضۃ اولیائے بیجاپور"[3] "رسول پاک کی صاحب زادیاں"[4] اور تذکرۂ ذاکرین[5] موجود ہیں جن کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مذہبی شخصیتوں کے مختصر حالات کتابی شکل میں اکٹھا کر کے تذکرہ کے روپ میں پیش کرنے کا رواج دکن میں ابتداء ہی میں پروان چڑھا۔

تذکرہ بطور تاریخ :

علم تاریخ ایک مسلسل تحقیقی مواد پیش کرنے والا علم سمجھا جاتا ہے جس کے ذریعہ تاریخ ، شہادت اور عہد کی بنیاد پر کسی شخصیت کی سیاسی حیثیت اور اس کے مرتبہ کو ظاہر کیا جاتا ہے۔ عام طور پر علم تاریخ تذکرہ سے بالکل مختلف انداز تحریر ہے کیونکہ تاریخ میں صرف سیاسی شخصیتوں درباریوں اور وزراء اور امراء کے طور و طرائق اور

---

[1] تذکرۂ خاصان خدا۔ از۔ مصطفائی بیگم مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد ۱۹۴۰ء

[2] اخبار الصالحین از۔ معشوق یار جنگ ۱۳۵۲ھ اعظم اسٹیم پریس

[3] تذکرۃ الاولیاء از۔ محمد عبدالحئی ۱۹۰۰ء مطبع مخزن الاخبار۔

[4] ترجمہ اولیاء روضۂ بیجاپور۔ از۔ شاہ صفی الدین قادری ۱۳۰۰ھ رائچور

[5] رسول پاک کی صاحبزادیاں۔ از اعجاز الحق قدسی ۱۳۶۳ھ۔ مطبع دستگیری

اور جنگ و جدال کو عہد کے پس منظر میں پیش کیا جاتا ہے۔ عام طور پر تذکرے اس قسم کی شہادتوں سے متعلق نہیں ہوتے۔ علم تاریخ اور تذکرے میں بنیادی طور پر تفریق کی علامتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ کیونکہ علم تاریخ ایک منظم اور جامع ترین علم ہونے کے علاوہ اس کا تسلسل عہد قدیم سے چلا آرہا ہے۔ جبکہ تذکرہ کی روایت درمیانی دور کی ایک ایسی کڑی ہے۔ جس کے ذریعہ شخصیت کے حالات پیش کرنے کے مخصوص انداز کی نمائندگی ملتی ہے۔ تذکرہ اور تاریخ دو مختلف طریقۂ اظہار ہیں۔ دکن کے تذکرہ نویسوں کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے تاریخی مواد کی پیش کشی کے ساتھ ساتھ تاریخی شخصیتوں کے کارنامے بھی تذکرہ کے روپ میں اجاگر کیے جس کی بیشتر مثالیں دکنی تذکروں کے مطالعہ کے دوران ظاہر ہوتی ہیں۔ "تذکرہ بابر"[1] تذکرۂ تیموریہ"[2] "تذکرہ اعظم الامرا ارسطوجاہ"[3] "مقام جمال الدین افغانی"[4] "حیات آصفیہ"[5] اور اسی قسم کی دوسری کتابوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ دکن میں تذکرہ کے فن کو تاریخ کے بیان کے لیے بھی استعمال کیا گیا بلکہ دکن کے تذکرہ نویسوں میں تذکرہ اور تاریخ

۱۔ تذکرۂ بابر۔ از۔ محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی۔ سنہ ۱۳۴۵ھ۔ مطبوعہ حیدرآباد۔

۲۔ تذکرۂ تیموریہ۔ از۔ احمد شفیع سنہ ۱۹۰۰ء شمس المطابع حیدرآباد۔

۳۔ تذکرہ اعظم الامرا۔ ارسطوجاہ از۔ عبدالمجید صدیقی سنہ ۱۹۳۹ء مکتبۂ ابراھیمیہ حیدرآباد۔

۴۔ مقام جمال الدین افغانی۔ از مبارز الدین رفعت سنہ ۱۹۴۰ء اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد۔

۵۔ حیاتِ آصفیہ از۔ محمد محبوب جنیدی سنہ ۱۳۶۵ھ حیدرآباد

کے فرق کو واضح کرنے کا احساس نہیں تھا بلکہ وہ بسا اوقات تذکرہ کا عنوان دے کر تاریخ مواد پیش کر دیتے تھے۔ چنانچہ دکن میں جتنے بھی تذکرے بطور تاریخ پیش کیے گئے ہیں ان میں یہی انداز غالب نظر آتا ہے۔ اس طرح دکنی تذکرہ نے اپنے اسلوب میں نہ صرف تغیر پیدا کیا بلکہ اس کے ذریعہ اظہار کو بھی مختلف تبدیلیوں سے وابستہ رکھا۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دکنی تذکرہ نویسوں کی یہ جدوجہد رہی کہ وہ ادب میں تذکرہ کی صنف کو نہ صرف جیتا اور جاگتا رکھیں بلکہ اُسے ہمہ گیر حیثیت کا حامل بھی بنا دیں۔ ۵۵

باب هفتم

دکنی تذکروں کی اہمیت وافادیت

دکنی تذکروں کے عہد اور اس دور کے کارناموں سے واقفیت حاصل کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جنوبی ہند کے اُردو ادب کی تاریخ میں تذکرہ بھی ایسی صنف ہے جس کے ذریعہ دورِ قدیم میں اُردو نثر کی نمائندگی ہوتی رہی۔ دکنی نثر نگاروں نے ادب کی اس صنف کو مختلف انداز سے پیش کیا۔ جس کی وجہ سے اردو ادب کی تاریخ میں دکنی تذکروں کی اہمیت وافادیت مُسلّم ہو گئی۔ کسی بھی ادب پارے، تخلیقی کارنامے اور اصناف ادب سے متعلقہ مواد کی اہمیت وافادیت کو ظاہر کرنے کے لیے مختلف طریقے اپنائے جاتے ہیں تاکہ اس دور کے زبان وادب سے واقفیت حاصل ہو سکے۔ دورِ جدید میں تنقید ایک ایسا موضوع ہے جس کے ذریعہ فن پارہ اور اصنافِ ادب کی اصولی جانچ کے ساتھ ساتھ محاکاتی جائزہ بھی لیا جاتا ہے اور یہی عمل دورِ جدید میں جانچ اور صحت کا میاب کسوٹی سمجھا جا رہا ہے۔

دکنی تذکرے مکمل طور پر اردو ادب کے ابتدائی دور کی یادگار ہیں جس کی وجہ سے ان میں فنی خامیاں موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ان میں ادبی طور پر چند ایسی کوتاہیاں بھی رہ گئی ہیں جو دکنی تذکروں کو معیاری بنانے میں حارج رہی ہیں۔ غرض یہ بات ثابت

ہو جاتی ہے کہ دکنی تذکرے صرف خوبیوں سے ہی مزین نہیں بلکہ ان میں معائب اور تشکیک کی گنجائش بھی پیدا ہوگئی ہے۔ چند تذکروں میں فنی اور ادبی رجحان کے محاسن پوری طرح اجاگر ہیں اور چند تذکرے صرف حالات اور واقعات سے مصنّف کی ذات کی وابستگی کو ہی فن تذکرہ کی معراج سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دکنی تذکروں میں جہاں محاسن اُجاگر ہوتے ہیں معائب کا اندیشہ بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ دکن کے ابتدائی تذکرہ نویسوں کو متن کی فراہمی میں کافی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اگرچہ فارسی اور عربی زبان کے تذکرے بطور نمونہ ان کے سامنے موجود تھے۔ لیکن وسائل کی دشواریاں انہیں بہتر اور جامع مواد کی پیش کشی سے روکتی رہیں۔

افادیت کے مرحلہ کو طے کرتے اور اہمیت کو واضح کرنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ کسی بھی تخلیق کے کیا مقاصد ہیں اور کس ماحول میں اس کی تشکیل ہوی۔ دکنی تذکروں کی اہمیت وافادیت کے بارے میں جب غور کیا جاتا ہے تو اندازہ ہوتا ہے کہ دکنی نثر کی یہ پہلی صنف ہے جس کے ذریعہ تذکرہ نویسوں نے اس عہد کے صوفی، علماء، مشائخین، شاعر ادیب، سماجی کارکن، مصلحین اور ارباب عقل وفہم کی زندگی کے حالات، کارنامے اور خدمات کو سراہنے کے لیے تحریر کا سلسلہ شروع کیا جو فنی طور پر "تذکرہ" کہلایا۔ اُردو ادب میں دکنی تذکروں کی اہمیت وافادیت اس وجہ سے بڑھ جاتی ہے کہ یہی وہ تذکرے ہیں جن کی بدولت ماضی کے جھروکوں میں ہم اپنے اسلاف کے کارناموں اور ان کی سادہ اور پر اخلاق زندگی کے حالات سے واقفیت حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے روحانی اثرات سے انسانیت کو حاصل ہونے والے فوائد کے بارے میں بھی مستند مواد دستیاب کر سکتے ہیں۔

دکنی تذکروں میں شخصی حالات، واقعات اور کارناموں کا مواد ہی دستیاب نہیں ہوتا بلکہ ان کے ذریعہ اس دور کی سماجی، سیاسی، اقتصادی، مذہبی اور ادبی سرگرمیوں کے بارے میں بھی تفصیلی علم ہوتا ہے جس کی وجہ سے عہد گذشتہ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور

یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ جنوبی ہند میں اسلاف کے کارناموں کو محفوظ رکھنے کا تصور شمالی ہند کے مقابلہ میں بہت پہلے پروان چڑھا۔

تنقید، دورِ جدید کا ایک ایسا واسطہ ہے جس کے ذریعہ حقائق سے واقفیت اور مبالغہ کا جز باآسانی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ دکنی تذکروں کی اہمیت وافادیت کو واضح کرنے کے لیے بھی ضروری ہے کہ ان تذکروں کا تنقیدی جائزہ لیا جائے جو دکن میں لکھے گئے تاکہ حقائق سے واقفیت کے علاوہ ان کے محاسن و معائب کا پتہ چل سکے۔ تنقید کا مسلک ہی فن پارہ کے حسن کو واضح کرنا اور خامیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے یہ ثابت کرتا ہو ہے کہ فن پارہ کی ادبی حیثیت کیا ہے۔ دکنی تذکروں کی ادبی حیثیت اوران کی اہمیت وافادیت کو واضح کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ان کے محاسن و معائب کا جائزہ لیا جائے اور فنی طور پر ثابت کیا جائے کہ عہد قدیم کے دکنی تذکرہ نویسوں اور دورِ جدید کے سوانح نگاروں نے محاسن اور معائب کی پیش کشی میں کس قدر حق پرستی اور دروغ گوئی سے کام لیا ہے۔ دکنی تذکروں کی اہمیت وافادیت واضح کرنے کے لیے انہیں (۱) دکنی تذکروں کے محاسن (۲) دکنی تذکروں کے معائب کے زیرِ عنوان بحث میں لایا جارہا ہے تاکہ فنی طور پر دکنی تذکروں کی حیثیت کا علم ہوسکے اور ادبی طور پر ان کے معیار و انتخاب کے علاوہ اس کے مرتبے سے واقفیت حاصل ہوسکے۔

دکنی تذکروں کے محاسن:

کسی بھی فن کی خوبی اور تکنکی بہتری کو ادبی طور پر محاسن کا نام دیا جاتا ہے۔ محاسن سے مراد فن اور ہیئت کے اعتبار سے وہ خوبیاں ہیں جن سے نہ صرف تخلیق میں نکھار پیدا ہوتا ہے بلکہ اس کی حیثیت اور مرتبے میں جاذبیت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ عام طور پر محاسن کو خصوصیت یا خوبی کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن ادبی اعتبار سے

محاسن صرف حسن اور خصوصیت کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ تخلیق کے ان مبہم گوشوں کی جانب بھی اشارہ کرتا ہے جس کی وجہ سے تخلیق کے مرتبے میں اضافہ ہوسکے۔ دکنی تذکروں میں محاسن کی تلاش درحقیقت ان کی اہمیت وافادیت کو بڑھا کر ان کی ہیئت اور مواد کا جائزہ لینا ہے تاکہ اندازہ ہوسکے کہ دکنی تذکرے کن خصوصیات کی بناء پر ادبی اور معیاری سمجھے جاتے ہیں۔ اور ان میں کس قدر تحقیقی و تخلیقی مواد بھی پایا جاتا ہے دکنی تذکروں کی اہمیت وافادیت کو واضح کرنے کے لیے ان کے محاسن کو چھ مختلف ابواب میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ ہمہ جہتی اظہار ۲۔ روایت پرستی

۳۔ مؤرخانہ شعور ۴۔ لسانی مزاج

۵۔ ذاتی غور وفکر ۶۔ انتخاب کا معیار

ان چھ عنوانات کے ذریعہ دکنی تذکروں کے محاسن کو بیان کرنے کا مقصد اس بات کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ دکنی تذکرہ نویسوں نے کس قدر جگر کاری کے بعد یہ تذکرے مرتب کیے۔ اگرچہ ان دکنی تذکروں میں تحقیقی مواد کی کمی ہے۔ لیکن اس دور میں کسی صاحب شخصیت کی زندگی کے حالات قلمبند کردینا بھی مشکل امر تھا۔ غرض دکنی تذکروں کی اہمیت کی وضاحت کے لیے محاسن کے پہلے جز ہمہ جہتی اظہار کے ذریعہ دکنی تذکروں کا جائزہ لیا جارہا ہے۔

۱۔ ہمہ جہتی اظہار:

دکنی تذکروں کی اہمیت وافادیت میں اضافہ کرنے والا ایک اہم جز دکن میں تحریر کردہ تمام تذکروں میں ہمہ جہتی اظہار ہے۔ عام طور پر تذکرہ نویس سہل پسندی سے کام لیتے ہوئے اپنے ماحول اور اطراف واکناف کے علاقوں سے وابستہ شعراء اور علماء کی حیات کو ضبطِ تحریر میں لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کیونکہ قرب وجوار میں مواد کی فراہمی

کے بیشتر مواقع دستیاب ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ اکثر تذکروں میں علاقہ داری عصبیت کو روا رکھا جاتا ہے۔ تذکرہ نویس اپنے دور میں اس قسم کا لحاظ نہیں رکھتا۔ لیکن دورِ جدید کے تنقیدی زاویئے تذکرے کے متن اور مواد کے پیشِ نظر یہ ثابت کر دیئے ہیں کہ تذکرہ نویس نے جانب داری کے اظہار کے ساتھ ساتھ علاقہ واریت کو بھی روا رکھا ہے۔

دورِ قدیم کے دکنی تذکرے کسی حد تک ان خصوصیات سے بے نیاز ہیں۔ شمالی ہند کے تذکروں سے جنوبی ہند کے تذکروں کا تقابل کیا جاتا ہے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وسائل کی دشواریوں کے باوجود دکن کے تذکرہ نویسوں نے علاقہ واریت کو ختم کرنے کی کوشش کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دکنی تذکروں میں شمالی ہند کے بیشتر شعراء کے حالاتِ زندگی تحریر کیے گئے جبکہ شمالی ہند کے اکثر تذکرے جنوبی ہند کے شاعروں اور ادیبوں کے حالاتِ زندگی پیش کرنے میں علاقائی جکڑ بندیوں کا شکار نظر آتے ہیں۔

دکنی تذکروں میں یہ انفرادیت موجود ہے کہ یہاں کے تذکرہ نویس فن کے قدرداں تھے۔ یہی وجہ رہی کہ وہ تذکرہ نگاری کے دوران علاقائیت اور عصبیت کو روا رکھنے سے احتراز برتتے رہے۔ جس کا بہترین اظہار دکن کے تذکرے "گلشن گفتار" سے ملتا ہے۔ اگرچہ "گلشن گفتار" کا تذکرہ نویس دکن سے تعلق رکھتا اور اس نے تذکرے میں ۳۲ شاعروں کے مختصر حالات اور منتخب کلام جمع کیا ہے۔ جن میں بیشتر شعراء دکن سے تعلق رکھتے ہیں[۱]۔ لیکن اس تذکرہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مرزا رفیع سودا، شاہ مبارک آبرو، شاہ حاتم جیسے دہلی کے نامور شعراء کا ذکر ملتا ہے۔[۲] دکن سے تعلق رکھنے کے باوجود اپنے تذکرہ میں دلّی کے شعراء کے حالات کا بیان یہ ثبوت فراہم کرتا ہے کہ جنوبی ہند کے تذکرہ

---

[۱] شعرائے اردو کے تذکرے۔ از ڈاکٹر حنیف نقوی۔ صفحہ ۲۵۵۔

[۲] 〃 〃 ۲۵۸ مطبوعہ نسیم بک ڈپو لاٹوش روڈ لکھنؤ، جون ۱۹۷۶ء

ذیں علاقہ داریت کے شکار نہیں رہے۔ جبکہ شمالی ہند کے ہم عصر تذکرے "نکات الشعراء" "تذکرۂ ریختہ گویاں" اور "مخزنِ نکات" میں علاقہ داریت اور عصبیت اس حد تک ہے کہ ان تذکروں میں دکن کے شعراء کے تذکرہ کو سپرد قلم نہیں کیا گیا۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ جنوبی ہند کے تذکرہ نویس ہمہ جہتی اظہار کو تذکرہ کی سب سے بڑی خصوصیت سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ دکنی تذکروں میں ہندوستان کے تمام شعراء کی زندگی کے حالات پیش کرنے کی مقدور بھر کوشش کی گئی ہے جبکہ شمالی ہند میں اس عہد کے تذکرے ہمہ جہتی اظہار کے پابند نظر نہیں آتے۔

جنوبی ہند کے دکنی تذکروں کی اہمیت وافادیت میں اس لیے اضافہ ہوجاتا ہے کہ ان تذکروں کے ذریعہ شمال اور جنوب کے فرق کو مٹا دیا گیا اور دکنی تذکرہ نویسوں نے اپنے تذکروں میں متن کی پیش کشی کے دوران ہمہ جہتی اظہار کو روا رکھتے ہوئے ممکنہ کوشش کی کہ تذکرہ میں علاقہ داریت اور عصبیت کا خاتمہ ہو جائے۔ شاید اسی کا نتیجہ ہے کہ شمالی ہند کے تذکروں کے مقابل جنوبی ہند کے تذکرے مختصر مواد پیش کرنے کے باوجود ہمہ جہتی اظہار کے معاملہ میں سبقت لے جاتے ہیں۔ دکن میں تحریر کردہ بیشتر تذکروں میں اس خصوصیت کا عکس پوری طرح واضح ہے۔ جس سے یہ ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ دکنی تذکروں میں محاسن کا عکس بیشتر حد تک ہے اور تذکروں میں ہمہ جہتی اظہار کی وجہ سے ان کی اہمیت وافادیت میں اضافہ ہو گیا ہے۔

۲۔ روایت پرستی :

دکنی تذکروں کے محاسن کا تنقیدی جائزہ لیا جائے تو یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ دکنی تذکرہ نویسوں نے اس فن کے فروغ کے لیے نہ صرف روایتی انداز اختیار کیا بلکہ روایت پرستی کو روا رکھتے ہوئے شاعروں کے تذکرے قلمبند کیے۔ دکنی تذکرے چونکہ

قدیم دور کی یادگار ہیں اور اُردو کے ساتھ دکنی دور کے ساتھ ساتھ چند شمالی ہند کے شعراء کی سوانح بھی پیش کرتے ہیں اسی لیے اس کے فن میں حقیقت سے زیادہ روایت کا عکس غالب ہے۔ عام طور پر دورِ قدیم میں روایت پرستی کو ہی فن کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ اسی لیے دکنی تذکروں میں روایت پرستی حد درجہ نظر آتی ہے جس کا مقصد صرف یہی تھا کہ اسلاف کے قائم کردہ اصولوں پر گامزن رہ کر ہی فن اور ادب کی خدمت کی جا سکتی ہے۔ اسی تصور نے دکنی تذکروں میں روایت پرستی کو فروغ دیا اور دکنی تذکرے مکمل روایت کے حامل ہو گئے۔

تذکرہ کے دوران حروفِ تہجی اور حروف جمل کی ترتیب کو روا رکھنا دکنی تذکروں کی سب سے بڑی خصوصیت ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تذکرہ نویسوں نے روایت پرستی کو اپنا مسلک بنایا۔ اگر وہ چاہتے تو کوئی علحدہ طریقہ بھی اپنا سکتے تھے۔ اس خصوصیت کی وجہ سے دکنی تذکرے حد درجہ روایتی ہو جاتے ہیں اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ شمالی ہند کے تذکرہ نگاروں کے مقابلہ میں جنوبی ہند کے تذکرہ نگار عقیدت پرستی کا شکار رہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دکنی تذکر مختصر مواد فراہم کرنے کے باوجود روایت پرستی کے بہترین نمونے ثابت ہوئے۔

دکنی تذکرہ نگاروں نے روایتی انداز اپنانے کا سلیقہ فارسی کے تذکروں سے حاصل کیا۔ اگرچہ بعض دکنی تذکرہ نویسوں نے روایت سے بغاوت کو ضروری نہیں سمجھا لیکن نئی ذہنی اپج کی جولانی اپنے تذکروں میں ضرور دکھائی۔ اس خصوص میں عطا کاکوی لکھتے ہیں۔

"چمنستانِ شعراء کی ترتیب میں اپنی ایک اپج رکھی تھی" [1]

[1] تذکرہ چمنستانِ شعراء۔ مرتبہ عطا کاکوی۔ مطبوعہ۔ آرٹ پریس سلطان گنج پٹنہ ۶ ۱۹۶۸ء

لچھمی نارائن شفیق، حمید الدین اورنگ آبادی، خواجہ خاں حمید، افضل بیگ قاقشال اور اسد علی خاں تمنا کے تذکروں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان تذکرہ نویسوں نے دکنی کے ابتدائی دور میں فارسی تذکروں کی تقلید کی۔ فارسی اور عربی کے بہترین عالم غلام علی آزاد بلگرامی کے تذکرہ "عقد ثریا" اور "ید بیضا" ان دکنی تذکرہ نویسوں کے سامنے بطور نمونہ موجود تھے۔ جن کی روایتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے دکنی میں تذکرے لکھے گئے۔ اگرچہ لچھمی نرائن شفیق اور دیگر تذکرہ نویسوں نے روایت سے کسی قدر اختلاف کرتے ہوئے اپج اور جدّت کو دکنی تذکروں کی خصوصیات میں شامل کیا لیکن فنّی اعتبار سے تذکرہ روایت پرستی سے ہی منسلک رہا۔ اس خصوص میں ڈاکٹر حنیف نقوی لکھتے ہیں:

"شعرائے فارسی کے وہ تذکرے جو اردو تذکرہ نویسی کے آغاز سے قبل معرض وجود میں آچکے تھے۔ شعرائے اردو کے تذکرہ نگاروں نے انہی کو اپنے لیے چراغ راہ بنایا انھوں نے انہی تذکروں سے ترتیب کے اصول و آداب اور نقد و نظر کے معیار مستعار لیے اور بعض حالات میں ان کے صفحات پر بکھری ہوئی معلومات سے بھی استفادہ کیا۔ چنانچہ وہ تمام خوبیاں اور خامیاں جو فارسی تذکرہ نگاروں کے یہاں موجود تھیں اردو تذکروں میں بھی داخل ہوگئیں"۔ [1]

اردو تذکروں میں انتخاب کلام اور حالات زندگی کے بیان میں جس قدر روایت پرستی دیکھی گئی ہے وہ پیش روؤں کی تقلید کا نتیجہ ہے۔ دکنی تذکروں میں یہ عکس فنّی طور پر شامل ہوگیا ہے اور چونکہ بہتر کام کی تقلید کوئی بُرا فعل نہیں اسی لیے اردو تذکروں میں روایت پرستی کو محاسن کے صیغہ میں شامل کیا جاتا ہے۔ دکن کے تمام تذکرے ان

---

[1] شعرائے اردو کے تذکرے از ڈاکٹر محمد حنیف نقوی ص ۹۲ مطبوعہ نسیم بک ڈپو۔ لاٹوش روڈ لکھنؤ ۱۹۷۶ء

ان محاسن کی پابجائی کرتے ہیں۔ کچھ تذکرے مکمل تقلید کے نمونے ہیں ۔ جبکہ چند تذکرے روایت کو توڑ کر جدت کی بنیاد رکھنے کے ضامن بھی بنتے ہیں۔ انہی خصوصیات کی وجہ سے دکنی تذکروں کی اہمیت وافادیت میں اضافہ ہوجاتا ہے اور یہی عمل انہیں امتیازی مرتبہ دلاکر تذکرہ نویسی کے فن کو دکن میں جلا ملنے کا ثبوت بھی فراہم کرتا ہے۔

۲۔ مؤرخانہ شعور:

تذکرے کے حسن میں بالیدگی پیدا کرنے والی صفت اور فنی طور پر زیب و زینت بڑھانے کا عمل تذکرہ میں مورخانہ شعور کے وجود سے ظاہر ہوتا ہے۔ تذکرہ نویس کوئی مؤرخ نہیں ہوتا لیکن کامیاب تذکرہ نگار کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ اپنے تذکرہ میں مورخانہ دلائل کے ذریعہ فنی نکھار پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجہ میں تذکرہ تاریخی شواہد سے مالا مال ہوجاتا ہے۔

تذکرہ میں مورخانہ شعور سے مراد تذکرہ نویس کا وہ ذاتی استدلال ہے جس کے ذریعہ وہ کھوج کے ساتھ شاعر وادیب کی تاریخ پیدائش اور وفات کے ساتھ ساتھ واقعات کی پیشکشی میں تاریخی احوال کا سہارا لیتا ہے۔ اور کسی قدر شاعر کے زمانے کے سیاسی حالات کو بھی پیش کرکے یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ شاعر کا معیار و مرتبہ اس عہد میں کس قدر بلند تھا۔ اسی مورخانہ شعور میں دربار داری، مشاعروں کے طرز و انداز اور شاہانہ سرپرستی کا ذکر بھی ملتا ہے۔ یعنی تذکرہ میں اگر صرف شخصیت کے حالات پیش کردیئے جائیں تو ایسا تذکرہ عہد کی نمائندگی نہیں کرسکتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ تذکرہ میں پیش کردہ شاعروں اور ادیبوں کی زندگی کے حالات کے ساتھ ساتھ اس دور کی مختصر سی تاریخی حیثیت کو بھی واضح کیا جائے۔ چنانچہ مورخانہ شعور تذکرہ میں نکھار پیدا کرنے کی علامت ہے۔ اسی وجہ سے تذکروں کی اہمیت وافادیت کے زمرے میں اس کا شمار محاسن میں کیا جاتا ہے۔ مورخانہ شعور تذکرہ نویس کی فطرت کا جز

نہیں ہوتا بلکہ وہ مطالعہ اور تحقیق کے ذریعہ اس طرز کو اپناتا اور تذکرہ کی زینت بناتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض تذکرہ نویسوں کے تذکروں میں مورخانہ شعور واضح نہیں ہوتا اور بعض تذکرہ نویس اپنے تذکرہ کو مکمل طور پر مورخانہ خصوصیات سے وابستہ رکھتے ہیں۔ دکنی تذکروں میں ان دونوں طرز و انداز کا مورخانہ شعور موجود ہے۔

دکنی تذکرے فنی اعتبار سے مورخانہ مزاج نہیں رکھتے اور نہ ان میں تاریخ نویسی کی صفت پائی جاتی ہے لیکن اس حقیقت سے انحراف نہیں کیا جا سکتا کہ دکنی تذکروں میں مورخانہ شعور نہ صرف غالب ہے بلکہ اعتدال کی حد تک مواد در متن میں تاریخی استدلال پیش کیا گیا ہے۔ ورنہ دکن کے بہ کثرت تذکروں میں مورخانہ شعور گمنامی کی حد تک رہتا ہے۔ اس خصوص میں ڈاکٹر زورؔ فرماتے ہیں۔

"یہ واقعی اُردو شاعروں کی بدقسمتی ہے کہ کسی نے بھی ایک ٹھیٹ مورخ بن کر شعراء کے حالات کو قلمبند نہ کیا۔ اگر اس طرح کی کوئی کوشش ملتی ہے تو وہ صرف علی ابراہیم کا تذکرہ ہے۔ لیکن اس میں بھی یہ خامی ہے کہ اس کی ترکیب ہجائی ہے۔" ؎۱

یہ حقیقت ہے کہ دکنی تذکروں میں مورخانہ شعور اس قدر واضح نہیں جتنا کہ فن تذکرہ میں ہونا چاہیے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض دکنی تذکرے اس قدر معیاری ہیں کہ انہیں مؤرخانہ شعور سے بے بہرہ نہیں کہا جا سکتا۔ چنانچہ اسد علی خاں تمنؔا اورنگ آبادی کے تذکرے "گل عجائب" کے بارے میں ڈاکٹر محمد حنیف نقوی تحریر کرتے ہیں۔

"ان اقتباسات سے مؤلف کے مؤرخانہ شعور کی پختگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ساتھ ہی

؎۱ دیباچۂ گلزار ابراہیم۔ از ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ صفحہ ۲

یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ جہاں انہوں نے اس تفصیل کے برخلاف اجمال یا اختصار سے کام لیا ہے وہاں تساہل یا بے اعتنائی کے بجائے بالعموم حالات کی نامساعدت اور حصولِ معلومات کی دشواریاں دخیل ہیں"[1]

دکنی تذکروں میں مورخانہ شعور کا یہ اثر ثبوت فراہم کرتا ہے کہ دکنی تذکرہ نویسوں نے نامساعد حالات اور مواد کی فراہمی میں دشواری کے موقع پر مورخانہ شعور کو ملحوظ نہیں رکھا ورنہ مواد کی فراہمی کے موقع پر انہوں نے اس انداز کو پوری طرح روا رکھا ہے۔ چنانچہ "تذکرۂ خاندان رفعت الملک" کے بارے میں نصیر الدین ہاشمی رقمطراز ہیں:

"یہ حیدرآباد کے ایک جاگیردار خاندان کا حال ہے جو نہایت تحقیق اور تجسس کے بعد قلمبند کیا گیا ہے۔"[2]

اس بیان کی روشنی میں اندازہ ہو جاتا ہے کہ دکنی تذکرہ نویسوں نے دورانِ تذکرہ ممکنہ طور مورخانہ شعور کے ذریعہ فن تذکرہ کے محاسن کو اجاگر کیا جس سے دکنی تذکروں کی اہمیت و افادیت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

۴۔ لسانی مزاج:

فن کے محاسن میں دورِ جدید کے تقاضوں کے مطابق لسانی مزاج کو بھی فوقیت دی جاتی ہے۔ عام طور پر لسانی مزاج سے مراد زبان کے الفاظ و بیان کی تشریح لی جاتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ لسانی مزاج کی تشکیل میں سب سے اہم جز زبان کے الفاظ کی بناوٹ اور ان کی تراش خراش کے ساتھ ساتھ عہد بہ عہد ان الفاظ میں رونما ہونے والی تبدیلیوں

---

[1] شعرائے اردو کے تذکرے از ڈاکٹر حنیف نقوی۔ صفحہ ۴۸۴

[2] کتب خانۂ آصفیہ کے اردو مخطوطات۔ از نصیر الدین ہاشمی (جلد اول) ص ۲۲۱ مطبوعہ مطبع ابراہیمیہ حیدرآباد ۱۹۶۱ء

کو زبان دانی کے اعتبار سے ظاہر کرنا لسانی مزاج کہلاتا ہے۔ اس خصوص میں صرف ونحو، فصاحت و بلاغت اور تحلیل صرفی کے علاوہ صوتیات کو بھی دخل ہے لسانی مزاج زبان کی بندشوں سے زیادہ الفاظ کی ادائیگی اور اس کے استعمال کے ساتھ ساتھ اس کے مبدائے اصلی تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ جسے ادبی زبان میں لسانی مزاج کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

دکنی تذکروں میں لسانی خصوصیات حد درجہ موجود ہیں۔ تذکرہ نویسوں نے انتخاب کلام کے دوران ان خصوصیات کو ملحوظ رکھا ہے جو دورِ جدید میں لسانی مطالعہ کا جز سمجھے جاتے ہیں۔ تذکرے لکھے جانے کے دور میں علم لسانیات کا کوئی وجود نہیں تھا لیکن دورِ جدید کے محققین نے دکنی تذکروں کے مطالعہ کے بعد ثابت کیا ہے کہ دکنی تذکرہ نویس لسانی مزاج کے پیشِ نظر تذکرہ کی روایت کو فروغ دیتے تھے جس کے ساتھ ہی ان کا فنی شعور بھی کارفرما ہوتا تھا۔

شمالی ہند کے تذکروں کے مقابلہ میں جنوبی ہند کے تذکرے لسانی مزاج کی پوری طرح پابجائی نہیں کرتے۔ دکنی تذکرہ نویسوں نے اپنے تذکروں میں شاعروں کے کلام کے نمونے کی پیش کشی کے ذریعہ لسانی مزاج کی نمائندگی کی ہے۔ لیکن یہ پیش کش اس قدر مبہم ہے کہ اس کا اظہار ممکنات میں سے نہیں ہے۔ پھر بھی دکنی تذکرے اس حیثیت سے لسانی مزاج کی ہم آہنگی کرتے ہیں کہ جس دور میں شمالی ہند کے شاعروں کے تذکرے لکھے گئے اسی عہد میں شاعری کرنے والے فنکاروں کے کلام کو یکجا کرکے دکنی تذکرہ نویسو نے دہلوی زبان اور دکنی میں لسانی فرق کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ دکنی اور دہلوی زبانوں میں امتیاز پایا جاتا ہے۔ لیکن یہ دونوں اردو کے ہی انداز بیان ہیں۔ اس کا بہترین اظہار صرف دکنی تذکروں کے مطالعہ سے ہوتا ہے۔ اگر دکنی تذکرہ نویس یہہ تذکرے نہ لکھتے تو یہ ممکنات میں سے نہیں تھا کہ دکنی زبان پر بیرونی زبان کے اثرات

کا محاکمہ کیا جاسکے۔ دکنی تذکرہ نویسوں نے جنوبی ہند کے شعراء کے ساتھ ساتھ شمالی ہند کے شاعروں کے زندگی کے حالات اور کلام کو اپنے تذکروں میں پیش کر کے دکنی زبان کی لسانی خصوصیت کو واضح کرنے کی کوشش کی جو دکنی تذکرہ نویسوں کے لسانی مزاج کی بہترین مثال ہے۔

۵۔ ذاتی غور و فکر:

تذکرہ نگاری کا فن ادبی اعتبار سے سیرت اور تاریخ سے قربت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تذکرے ذاتی غور و فکر کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ سخنوری کے میدان میں شاعروں کی سرگرمیوں اور ان کی غیر معمولی صلاحیتوں کو پیش کرنے کے لیے تذکرہ نگاروں کو غور و فکر سے کام لینا پڑتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ کسی تذکرے کے نمونے کو سامنے رکھتے ہوئے تذکرہ نگار اپنی فکری صلاحیت کو پروان چڑھائے لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ شاعروں کے حالات، حیات اور کارنامے پیش کرنے کے لیے ذاتی غور و فکر سے کام لے۔ ورنہ تذکرہ خالق کی خوبیوں سے مستثنیٰ ہو جائے گا۔ اس اعتبار سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ تذکرہ نویس صرف حالات و واقعات کو جوں کا توں پیش کرنے والا کوئی نقال نہیں ہوتا بلکہ ایک فن کار ہوتا ہے اسی لیے تذکرے کی ترتیب کے موقع پر اسے شخصی دلچسپی اور ذاتی غور و فکر کا سہارا لینا پڑتا ہے اور اگر اس خصوصیت کو بالائے طاق رکھ دے تو ایسا تذکرہ ادبی معیار سے کمتر ہو جائے گا۔

دکنی تذکروں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ تذکرہ نویسوں نے شعراء کے حالات زندگی اور وفات کی تاریخوں کے تعین کے علاوہ ان کے دور کی خصوصیت کے ساتھ ساتھ ان کی فنی افضلیت کو بھی پیش کرنے کی کوشش کی ہے جس کی وجہ سے دکنی تذکرے اہمیت اور افادیت کے نئے رجحانات کو قائم کرتے ہیں۔ اور یہی محاسن دکنی تذکرہ نگار کو مقبولیت بخشتے ہیں۔ تذکروں میں ذاتی غور و فکر کو ظاہر کرنے کے لیے اسد علی خاں تمنا اورنگ آبادی

کے تذکرہ "گلِ عجائب" کے بارے میں ڈاکٹر محمد حنیف لکھتے ہیں :

"تمنا کے یہاں تعارف نویسی کا عام معیار بہت بلند ہے ۔ وہ شعرائے اردو کے ان تذکرہ نگاروں میں سے ایک ہیں جن کی سلیقہ مندی کسی بھی صاحبِ نظر نقاد سے خراجِ تحسین حاصل کیے بغیر نہیں رہ سکتی ۔ انہوں نے تذکرہ نگاری کے فن کو اس مقام تک لے آنے کی کوشش کی جہاں ان کی دین، ادب کے مورخ کے لیے ایک نعمتِ غیر مترقبہ کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔[1]

تذکرہ نویسی کے لیے تذکرہ نگار کی جدوجہد اور اس کی فکر کی بالیدگی کا اندازہ اس طرح بھی لگایا جا سکتا ہے کہ جب تک تذکرہ نگار غور و فکر سے کام نہیں لیتا اور شاعروں کی زندگی کے بارے میں تفصیلات حاصل کرنے کے لیے جستجو نہیں کرتا اس وقت تک تذکرہ کی تشکیل ممکن نہیں ۔ عام طور پر تذکرہ ایک تالیف کا درجہ رکھتا ہے اور یہ تصور عام ہے کہ تالیف کی پیش کشی کے لیے مؤلف کو زیادہ جانفشانی کی ضرورت نہیں پڑتی ۔ لیکن یہ تصور اس وقت غلط ثابت ہو جاتا ہے جبکہ تذکرہ نگار اپنی تالیف میں شخصیت کی سوانح کے بعد اس کے کارناموں اور خدمات کے ساتھ ساتھ سیرت پر روشنی ڈالنے کے لیے غور و فکر کا سہارا لیتا ہے ۔ اور اپنی ذہنی اور تخلیقی صلاحیت کے ذریعہ صاحبِ تذکرہ کی شخصیت کو ابھارنے کی کوشش کرتا ہے ۔ اس خصوص میں ڈاکٹر سید عبداللہ رقمطراز ہیں ۔

"بعض تذکرے بادی النظر میں یکساں نظر آتے ہیں اور ان میں مضمون کا اتحاد دکھائی دیتا ہے ۔ مگر نظر غائر سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر بڑا تذکرہ اپنی کوئی

---

[1] شعرائے اردو کے تذکرے ـــــــ از ۔ ڈاکٹر حنیف نقوی ص ۴۸ ، ۱۳۲

نہ کوئی مستقل خصوصیت رکھتا ہے جو دوسرے تذکروں میں نہیں پائی جاتی کوئی سیرت کی تصویر کشی کرتا ہے۔ کوئی اصلاح سخن کے لحاظ سے اہم ہے کوئی عمدہ انتخاب پیش کرتا ہے۔ کوئی ایک خاص دور اور گروہ کا تذکرہ ہے۔ ان میں سے کوئی جامع ترین ہونے کا مدعی ہے اور کوئی مختصر لکھنے کا اقراری۔ غرض ہر ایک میں جدا جدا امتیازات موجود ہیں جو ان میں سے ہر ایک کے الگ وجود و بقائے کے لیے وجہ جواز ہیں۔[1]

ڈاکٹر سید عبداللہ نے یہ ثابت کر دی ہے کہ کوئی بھی تذکرہ فنی اعتبار سے ایسا نہیں ہوتا جو بغیر ذاتی غور و فکر کے لکھا جا سکے۔ جس طرح ادب کی دیگر اصناف کی پیش کشی کے لیے تخلیق کار کو غور و فکر سے کام لینا پڑتا ہے اسی طرح تذکرہ نویسی کے دوران بھی ذاتی غور و خوض ضروری ہے اور یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ دکنی تذکروں میں ذاتی غور و فکر کا عکس نمایاں ہے جو تذکرہ کے محاسن میں شامل ہونے کی وجہ سے ان کی اہمیت و افادیت کو دوبالا کرنے کا ضامن ہے۔

۶۔ انتخاب کا معیار:

تذکروں میں شاعروں کی زندگی کے حالات و واقعات کے ساتھ ساتھ ان کے کلام کا انتخاب بھی درج ہوتا ہے جو تذکرہ کی خصوصیات میں شامل ہے اور اس کا شمار بھی محاسن میں کیا جاتا ہے۔ عام طور پر شعر کا انتخاب مشکل امر ہے اس مسئلہ کو تذکرہ نویس حل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اردو کے تمام تذکروں میں شاعروں کے حالات کے علاوہ

---

[1] شعرائے اردو کے تذکرے اور تذکرہ کا فن از۔ ڈاکٹر سید عبداللہ صفحہ ۱۳۲ مطبوعہ مکتبہ شعر و ادب دہلی۔

ان کا منتخب کلام بھی درج کیا گیا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ تذکرہ میں کلام کا انتخاب بھی ایک اہم جز ہے اور دکنی شعراء نے اس اصول کی پیروی کی ممکنہ کوشش کی ہے۔ جس کے ذریعہ اصلاح سخن اور تنقید کلام کا حق ادا کیا گیا ہے۔ عام طور پر تذکرہ نویس اپنے فن کو واضح کرنے اور ادب کی تاریخ میں شاعر کا درجہ متعین کرنے کے لیے انتخاب کلام اور اصلاحِ سخن سے کام لیا کرتے تھے تاکہ تذکرہ میں شاعر کے مذاق اور مزاج سے متعلقہ اشعار کو تذکرہ نویس اپنے ذوق کے مطابق پیش کر سکے۔ تذکرہ میں انتخاب اشعار کا مقصد صرف اپنے مذاق کی نمائندگی کرنا ہی نہیں بلکہ اس کے ذریعہ ذوق صحیح کی تشفی کا سامان فراہم کرنا ہوا کرتا تھا۔

دکن کے تمام تذکروں میں یہ خصوصیت واضح طور پر پائی جاتی ہے جس کے ذریعہ تذکرہ نویسوں نے شاعروں کی صفات اور ان کی وضع داری کو پیش کیا ہے اور اسی وجہ سے تذکرے یادگاری حیثیت کے حامل ہونے لگے۔ اس خصوصیت سے تنگ آکر ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں

"تذکرہ نگار اپنے ناموروں میں نیکی، شرافت پابندئ وضع، خوش اخلاقی اور عام اوصاف حسنہ کو بطور خاص نمایاں کرتے ہیں۔ ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ تذکرہ نگار جن شاعروں کے اوصاف کا ذکر کرتے ہیں۔ ان میں ایک چیز۔ وضعداری بھی ہے یہ استقلالِ مزاج اور ثابت قدمی کا محیر العقول نمونہ پیش کرتی ہے۔ مراد اس سے یہ ہے کہ ہمارے بزرگ شروع میں جس وضع یا طریقہ کو اختیار کر لیتے تھے عمر بھر اس پہ قائم رہا کرتے تھے۔"[1]

ان اعتراضات اور خصوصیات کے پیش منظر اندازہ ہوتا ہے کہ تذکرہ نویس انتخاب کلام کے ذریعہ یادگاری خصوصیت کو واضح کرنا چاہتے تھے۔ جس کے ساتھ ہی یہ مقصد بھی

---

[1] شعرائے اُردو کے تذکرے اور تذکرہ نگاری کا فن۔ از ڈاکٹر سید عبداللہ ص ۱۲۴-۱۲۵۔ مطبوعہ مکتبہ شعر وادب دہلی۔

کارفرما تھا کہ انصاف اور صداقت کے ساتھ حقیقت نگاری کی جائے چنانچہ انتخاب کلام کے دوران جو خصوصیت دیکھی گئی ہے وہ راست بازی ہے۔ اور تذکرہ نگار اسے قائم رکھنے کی پوری کوشش کرتا ہے۔ اس خصوص میں ڈاکٹر سیدہ جعفر رقمطراز ہیں:

"تذکروں کی تنقیدی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ تذکرہ نویسی میں تنقید نگاری کا ہیولہ بنتا ہوا نظر آتا ہے۔ شعرا کے کلام پر رائے دینا اور انتخاب کلام پیش کرنا یا معاصرین سے ان کا مقابلہ کرنا یا فارسی شعراء سے اردو شعراء کا موازنہ کرنا بغیر تنقیدی صلاحیت کے کیسے ممکن تھا۔ تذکروں کا ایک اور تنقیدی پہلو یہ بھی تھا کہ میرؔ، میر حسن، قائمؔ، شیفتہ اور مصحفی وغیرہ نے جہاں ضرورت محسوس کی تھی کلام پر اصلاحیں بھی دی تھیں اصلاحِ کلام دراصل فنّی اور عملی تنقید ہی کا ایک پرتو ہے۔ اصلاح ایک طرح سے اصولی تنقید اور عملی تنقید کا بڑا اچھا امتزاج ہوتا ہے۔ تذکروں میں جو اصلاحیں ملتی ہیں ان کی نوعیت زیادہ تر صوری اور لسانی ہے معنوی پہلو بھی ان کے پیش نظر رہا ہے۔ ان اصلاحوں میں صرف فصاحت، طرزِ ادا کی دلعزیبی، عروض کی پابندی، صنائع بدائع کے استعمال اور زبان و محاورہ بندی کے اصولوں کے علاوہ معنی آفرینی، ندرت خیال اور نزاکت تخیل پر بھی توجہ کی گئی ہے۔ تذکروں کی اصلاحیں جابجا تنقیدی اشارے لی ہوئی ہیں اور اس بات کا ثبوت ہیں کہ تذکرہ نگار فن کے کتنے رمز آشنا اور ادب کے کیسے اچھے پارکھ تھے۔" [1]

اس بیان سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ تذکرہ کے محاسن میں انتخاب کلام کے دوران

---

[1] فن کی جانچ۔ از ڈاکٹر سیدہ جعفر۔ صفحہ نمبر ۶۹ مطبوعہ نیشنل بک ڈپو حیدرآباد۔ ۱۹۶۵ء

تذکرہ نویسوں نے نہ صرف تنقیدی انداز کو روا رکھا بلکہ اصلاح سخن پر بھی توجہ دی۔ اس اعتبار سے دکنی تذکروں کی اہمیت و افادیت کے باب میں "انتخاب کلام کا معیار" نہ صرف تنقید کلام کی نمائندگی کرتا ہے بلکہ اصلاح سخن کے کارناموں سے بھی واقفیت دلاتا ہے۔ جن کے عمل سے دکنی تذکروں میں محاسن کی بازیافت ہوتی ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ تذکرہ نویس انتخاب کلام اور اصلاح سخن کے ذریعہ تذکروں میں فنی طور پر نکھار پیدا کرنے کے علاوہ ان کے معیار کو بھی بلند کرنا چاہتے تھے۔

دکنی تذکروں کے معائب:

کوئی بھی فن جب ابتدائی مدارج میں ہوتا ہے تو لازمی طور پر اس میں کسی نہ کسی ٹکنیکی کمی کا ہونا لازمی ہے۔ دکنی تذکروں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اس دور کی یادگار ہیں جبکہ اُردو میں فن تذکرہ نویسی ابھی خال خال ہی تھا۔ جس کے نتیجہ میں ادبی طور پر ان تذکروں میں کسی نہ کسی قسم کی خامی کا پایا جانا فطری امر ہے۔

ادبی طور پر معائب سے مراد فن کی وہ خامیاں اور کوتاہیاں مراد لی جاتی ہیں جو شعوری یا لاشعوری طور پر فنکار سے سرزد ہوں اور جنہیں فن کے اصول نے غلط قرار دیا ہو۔ یعنی معائب سے مراد وہ ٹکنیکی اور فنی بے ضابطگیاں ہیں جو کسی فن پارہ میں دانستہ و نادانستہ طور پر رواج پاگئی ہوں۔ اس طرح معائب ادبی اعتبار سے غیر معقولیت اور ادب کے محرکات میں رکاوٹ پیدا کرنے والا عمل ہے جس سے فن کے اصول اور طریقے نہ صرف متاثر ہوتے ہیں بلکہ ادبی بے ضابطگی کے علاوہ مذاق سخن اور معیار فن میں بھی تفریق پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی بھی فن کی اہمیت و افادیت میں معائب کو پست نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ لیکن اس حقیقت سے انحراف نہیں برتا جا سکتا کہ حقائق کی بازیافت کے لیے محاسن کے ساتھ ساتھ معائب کو بھی پیش نظر رکھنا پڑتا ہے۔ دکنی تذکروں میں موجود

فنی معائب کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

۱۔ زبان کا سقم　　　　۲۔ غیر تفصیلی مواد

۳۔ ہمدردانہ رویہ　　　　۴۔ ماخذات اور حوالے

دکنی تذکرہ نویسی فن کی معراج نہیں اور نہ ہی اس کے ذریعہ فنِ تذکرہ کے مکمل اصولوں کی نمائندگی ہوتی ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ دکنی تذکرے اپنے ماحول کے اعتبار سے نقشِ اول کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس لیے ان کے مواد اور متن میں معائب کا ظہور ہوتا ہے۔ یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ دکنی تذکرہ نویسوں کو فنی طور پر تذکرہ نگاری کے لیے بطور نمونہ فارسی کے بہترین تذکرے دستیاب ہو چکے تھے لیکن ان سے استفادہ کے باوجود دکنی تذکروں میں معائب کی زیادتی سے اندازہ ہوتا ہے کہ تذکرہ نویسوں نے فنی اعتبار سے اغلاط کو روا نہیں رکھا بلکہ بیشتر دکنی تذکرے شخصیتوں کے بارے میں تاریخ و متن کی پیش کشی میں نامساعد وجوہات کی بنا پر کج روی کے علمبردار بن گئے۔ اگر دکنی تذکرہ نویسوں کو ہر شخصیت کے بارے میں موزوں ترین مواد اور اس کے تمام تر حالات دستیاب ہو جاتے تو وہ کبھی اپنے فن میں معائب کا اظہار نہ کرتے۔ دکنی تذکروں میں انداز فکر اور بیان کے پیرائے میں کوئی سقم نہیں بلکہ ادبی جانچ پڑتال کی کسوٹیوں میں فرق نظر آتا ہے اس کے ساتھ ہی شخصیت کے تمام واقعات دکنی تذکروں میں واضح نہیں ہوتے۔ دکنی تذکروں کی فنی خصوصیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے انہیں چند عنوانات کے ساتھ بیان کیا جا رہا ہے تاکہ دکنی تذکروں کی اہمیت و افادیت کے لیے محاسن کے ساتھ ساتھ معائب سے بھی واقفیت ہو سکے دکنی تذکروں کی اہمیت و افادیت واضح کرنے کے دوران ایک طرفہ رویہ سے کام نہیں لیا گیا۔ اس کے علاوہ جدید تنقید کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ فن پارہ کی پیش کشی میں محاسن اور معائب دونوں کو پیش نظر رکھا جائے۔

۱۔ زبان کا سقم :

دکنی تذکروں میں صنعت گری کا رجحان فارسی تذکروں سے دل چسپی کے زیر اثر پیدا ہوا۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ دکنی تذکروں میں زبان اور بیان کے انداز میں کسی قدر فارسیت کا اثر غالب ہے اگرچہ یہ تذکرے دکن میں لکھے گئے۔ اور دکن میں بود و باش اختیار کرنے والے شاعروں کی زندگی کے حالات پیش کرتے ہیں لیکن اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ ان تذکروں میں بیان فارسی زبان میں دیا گیا ہے۔ یعنی دکنی کے شاعروں کی زندگی کے حالات فارسی میں لکھے گئے ہیں۔ اور ان کا نمونۂ کلام دکنی زبان میں پیش کیا گیا ہے۔ اس تفریق کو زبان کے سقم میں شامل کیا جا سکتا ہے کیونکہ جس دور میں یہ تذکرے لکھے گئے اس وقت دکنی میں شعر گوئی کا چرچا ہونے لگا تھا جس کے بعد لازمی امر تھا کہ تذکرے بھی اسی زبان میں لکھے جاتے اس کے علاوہ دکنی تذکروں میں زبان کے سقم کا ایک اور انداز پایا جاتا ہے جو اُردو کے ہر تذکرہ کی روایت میں داخل ہے۔ اس خصوص میں ڈاکٹر سیّدہ جعفر لکھتی ہیں۔

> "تذکروں کو دل چسپ، جاذبِ نظر اور مقبولِ خاص و عام بنانے کے لیے تذکرہ نگاروں نے رنگین زبان اور شاداب و شگفتہ اندازِ بیان کو اپنایا تھا تذکرہ نگاری کے قدیم عہد میں مقفّیٰ و مسجّع نثر کو قبولِ عام کی سند حاصل ہو چکی تھی۔ معمولی معمولی باتیں بھی جو براہِ راست انداز میں بآسانی بیان کی جا سکتی تھیں عبارت آرائی، لفّاظی، صوری نمائش اور ظاہری طمطراق کے التزام کی وجہ سے غیر معمولی اہمیت کی حامل بن جاتیں۔[۱]"

---

[۱] فن کی جانچ۔ از ڈاکٹر سیدہ جعفر ص۲۲ مطبوعہ نیشنل بک ڈپو حیدر آباد ۱۹۶۵ء

تذکرہ نگاری کا قدیم دور دکن سے ہی وابستہ ہے اور ان تذکروں میں زبان کا سقم اس قدر ہے کہ اکثر تذکرے شخصیت کی زندگی کے بارے میں مواد فراہم کرنے کی بجائے زبان دانی سے کام لیتے ہیں۔ بیان کی شگفتگی اور الفاظ کا بہاؤ اس قدر تیزی کے ساتھ دکنی تذکروں میں رواں دواں ہے کہ تذکرہ نویس کے بیان کی وجہ سے شخصیت کے تمام کارنامے الفاظ کے سیلاب کی نذر ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ دکنی تذکروں بالخصوص عہد قدیم کے تذکروں میں یہ رجحان بدرجہ اتم موجود ہے کہ تذکرہ نویس شخصیت کے حالات کی پیش کشی سے زائد اپنے بیان کو بہت زیادہ دلکش بنانے پر توجہ دیتا ہے تاکہ اس کی زبان کی بوقلمونی سے عام انسان متاثر ہو جائے۔ دکنی تذکروں میں اسی قسم کا مزاج نہ صرف زبان کے سقم کی نمائندگی کرتا ہے بلکہ یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ اس انداز کے ذریعہ دکنی تذکرہ نویسوں نے اپنے فن میں معائب پیدا کر کے اس کی اہمیت وافادیت کو کسی قدر گھٹا دیا۔

ابتدائی عہد کے تمام تذکروں میں زبان کے سقم کا رجحان عام ہے جس کی وجہ سے یہ فیصلہ دینا قطعی غلط ہے کہ صرف دکنی تذکرے سقم زبان کے مرتکب ہوئے ہیں۔ چونکہ تمام قدیم تذکروں میں روایتی طور پر زبان کے سقم کا انداز یکساں پایا جاتا ہے اور ان میں یہ خامی دورِ قدیم کی نمائندگی کرتی ہے۔ اسی لیے قدیم تذکروں میں موجود زبان کے سقم کو تنقیدی بحث کا ذریعہ بنانا حق پرستی نہیں کیونکہ اس عہد میں زبان کے اندازِ بیان کی روش اسی نہج کی تھی جو آج کے دور میں قابل قبول نہیں۔ اسی وجہ سے تذکروں میں زبان کے سقم کو تنقید کا موضوع نہیں بنایا جا سکتا اور اس پر مزید بحث اس فن کی روایت کو توڑنے کے مترادف ہے۔

۲۔ غیر تفصیلی مواد:

دکنی تذکروں میں اگرچہ فن کی روایت محسوس کی جا سکتی ہے لیکن تذکروں میں فنی طور پر یہ بات دیکھی گئی ہے کہ

وہ شخصیت کے بارے میں تفصیلی مواد فراہم نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ تذکرہ نگار متن کی پیش کشی میں تساہل سے کام لیتا ہوا نظر آتا ہے جو فنی طور پر ایسا سقم ہے جسے غیر تفصیلی مواد کے زیر عنوان بحث میں لایا جاتا ہے۔ عام طور پر دکنی تذکروں میں متن کی پیش کشی کی حد تک تتبع کا رجحان بری طرح کھٹکتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ تذکرہ نگار شخصیت اور سیرت کے معاملہ میں بیان کے دوران رواداری سے کام لے کر اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ کسی شاعر کے بارے میں مفصل حالات سے واقفیت نہ رکھتا ہو تو کسی طرح بھی اس سے دامن چرایا جائے۔ اس خصوص میں تذکروں پر اعتراض کرتے ہوئے ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں۔

"ان سے مفصل حالات معلوم نہیں ہوتے اور ریجنل تحقیق کی بجائے نقل درنقل ہوتی ہے اور بعض صورتوں میں ماخذ کا ذکر نہیں ہوتا۔"[۱]

شاعر کی شخصیت اور اس کے حالات تذکرہ میں بیان کرتے وقت تذکرہ نویس کا میلان صرف شاعر کے کلام سے دلچسپی ظاہر کرنا ہوتا ہے چونکہ وہ کسی شاعر کی شعر گوئی سے متاثر ہوتا ہے۔ اسی لیے اس کے کلام کو یکجا کرنے کے لیے شاعر کے مختصر سے تعارف کا سہارا لیتا ہے جس کی وجہ سے شاعر کے بارے میں متن کی فراہمی کیلئے تحقیق جستجو کا سہارا نہیں لیتا جس کے نتیجہ میں اردو کے تمام تذکروں میں فروگذاشت اور تساہل عام طور پر دکھائی دیتا ہے۔ جس سے تذکروں کے معائب میں اضافہ ہوتا ہے۔ اکثر تذکروں میں شاعروں کے حالات کے علاوہ سنین کی پیش کشی سے بھی لاپرواہی برتی گئی ہے۔ یہی نہیں بلکہ غیر تفصیلی مواد تذکروں میں اس حد تک کارفرما نظر آتا ہے کہ بعض تذکروں میں صرف شاعروں کے تخلص کو لکھ کر نمونۂ کلام پیش کر دیا گیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تذکرہ نگاروں نے

۱۔ شعرائے اردو کے تذکرے اور تذکرہ نگاری کا فن۔ از ڈاکٹر سید عبداللہ۔ صفحہ نمبر ۱۱۰ مطبوعہ مکتبۂ شعر وادب دہلی۔

متن کی پیشکش کے لیے شاعر کے نام اور حالات سے مکمل واقفیت کے لیے جگر کوشی سے کام نہیں لیا۔ اکثر شاعروں کے بارے میں مواد پیش کرنے کے دوران تذکرہ نگار صاف طور پر نام سے عدم واقفیت اور تاریخ پیدائش اور وفات سے لاعلم ہونے کا ذکر کرتے ہوے صرف اس کے کلام کی خصوصیات کو پیش کر دیتا ہے۔ ان تمام خامیوں کے پیش نظر یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ دکنی تذکروں کے علاوہ اُردو کے تمام تذکروں میں سوانحی مواد کا صیغہ اس قدر کمزور رہا ہے کہ ان تذکروں میں شاعروں کی شخصیت اور ان کی زندگی کے حالات چھپ کر رہ گئے ہیں۔ جو تذکروں میں غیر تفصیلی مواد کے نمائندہ ہیں۔ دکنی تذکروں کی اہمیت وافادیت کے جائزے کے دوران اس عمل کو معائب میں شمار کیا جائے گا۔ دکن کے تذکرہ نگاروں میں اسد علی خاں تمنّا ایک ایسے شاعر ہیں جن کے تذکرہ "گل عجائب" میں ترتیب متن اور مواد کی تفصیل پوری طرح نمایاں ہے۔ اس خصوص میں ڈاکٹر حنیف نقوی تمنّا کی اس خوبی کو سراہتے ہوے لکھتے ہیں:

"تمنّا نے اس تذکرہ میں جن شاعروں کو شامل کیا ہے وہ جہاں ان کے ہم عصر تھے وہیں ان سے بیشتر ان کے ہم وطن بھی تھے یا پھر کسب معاش کے سلسلے میں دکن سے تعلق رکھتے تھے۔ اس قرب زمانی و مکانی سے انھوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے اور اکثر شعراء کے بارے میں نہایت مفصل اور اہم معلومات فراہم کی ہیں ولادت و وفات اور دوسرے سوانح زندگی کی تواریخ اور سنین کے حوالے بھی ان کے یہاں بکثرت ملتے ہیں۔" [1]

اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ترتیب متن اور تفصیل مواد کی پیش کشی کے لیے

---

[1] شعرائے اُردو کے تذکرے۔ از ڈاکٹر حنیف نقوی صفحہ ۸۱، ۲۸۰

ذکرہ نویسوں کو موزوں ماحول نہ مل سکا۔ اور اس دور میں مواد کی فراہمی دشوار مسئلہ تھی۔ اسی لیے تذکروں میں غیر تفصیلی مواد بکثرت دکھائی دیتا ہے۔ اگر تذکرہ نویسوں کو مواد کی دستیابی کے تمام مواقع فراہم ہو جاتے تو قدیم دور میں ہی سوانح نگاری کا آغاز ہو جاتا ہے۔ غیر تفصیلی مواد کی وجہ سے اردو نثر میں تذکرہ کی صنف قائم ہوئی اور تذکروں میں غیر تفصیلی مواد فنی طور پر معائب میں شامل ہونے کے باوجود بھی اہمیت رکھتا ہے۔

۳۔ ہمدردانہ رویّہ :

ادبی طور پر کسی بھی فن میں فن کار کا رویّہ عام طور پر تائید یا تردید کے حق میں ہوتا ہے جہاں تک تنقید کا سوال ہے۔ اس حقیقت سے گریز نہیں برتا جا سکتا کہ فن کی جانچ کے معاملے میں فن کار کو غیر جانب دار ہونا چاہیے۔ قدیم تذکروں کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتی ہے کہ اس دور کے تذکرہ نویسوں میں اخلاقی رجحانات اس قدر کارفرما تھے کہ انھوں نے اپنے تذکروں میں جانب داری کی بجائے ہمدردانہ رویّہ اختیار کیا۔ دکنی تذکروں کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تذکرہ نویسوں نے شاعروں کی زندگی کے حالات مرتب کرتے وقت نامور شعراء میں رائج شدہ اوصافِ حمیدہ کو پیش کرنے میں نہ صرف ہمدردی سے کام لیا ہے بلکہ بسا اوقات مبالغہ کی حد تک بیانات قلمبند کر دیئے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دورِ قدیم میں تذکرہ نویس خوبیوں کو مختلف الفاظ اور پیرائے میں بیان کرنا فنِ تذکرہ کی خصوصیت سمجھتے تھے۔ جس کے نتیجہ میں تذکرے ہمدردانہ رویّہ کے حامل ہو گئے۔ تذکروں کی اس فنی خامی کو اجاگر کرتے ہوئے ڈاکٹر سیّدہ جعفر لکھتی ہیں :

> "تذکروں کے تمام انتخابات، نمائندہ انتخابات نہیں۔ ان میں بعض جگہ خامیاں نظر آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ انتخاب بعض اوقات محض انفرادی ذوق اور وجدان کی رہنمائی کا رہینِ منت ہوتا ہے اور دوسرے یہ کہ تذکرہ نویس کی

ہم دردیاں جس شاعر کے ساتھ ہوتیں نفسیاتی طور پر اس کا بے جان، سپاٹ اور پھیکا شعر بھی تذکرہ نویس کی توجہ کا مرکز بن جاتا اور بسا وقت اساتذہ کے بہترین شعر بھی تذکرہ نگار کی توجہ کے محتاج ہوتے ہیں اور نسبتاً کم تر درجہ رکھنے والے اشعار پر تذکرہ نگار سر دھننے لگتا ہے۔ چند مثالوں کو چھوڑ کر یہ انتخابات اپنے عہد کے مذاقِ سخن اور معیارِ فن سے خاصی مطابقت رکھتے تھے۔"[۱]

تذکرہ نگاروں کے ہم دردانہ رویّوں کی جھلکیاں اس بیان میں پوری طرح نمایاں ہیں دکنی تذکروں میں بھی یہی انداز غالب ہے جس کا نتیجہ یہی ہے کہ اہمیت و افادیت کے لحاظ۔ دکنی تذکروں میں ہمدردانہ رویّہ فنی طور پر معائب کا غماز ہے ۔۔۔ دکنی تذکروں میں اس رد کی کارفرمائی بسا اوقات بجا نظر آتی ہے اور اکثر موقعوں پر یہ رویّہ بے جا دکھائی دیتا ہے غرض دکنی تذکروں میں اردو کے دیگر تذکروں کی طرح ہمدردانہ رویّہ کے ذریعہ تذکرہ نویس نے اپنے من پسند شاعر کی خصوصیات کو واضح کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ان کا ذوق شعر کافی بلند ہے اور یہی عمل سقم کی بنیاد بن گیا۔

دکنی تذکروں میں ہمدردانہ رویّے کا تنقیدی جائزہ لیا جائے تو یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ دکنی تذکرہ نویسوں نے اپنے ذوقِ صحیح کی نمائندگی اور شعر سمجھنے کی صلاحیت واضح کرنے کے لیے تذکروں کے دوران شاعر کی زندگی کے حالات سے زیادہ ان کے کلام سے ہمدردی دکھائی جو دورِ جدید کی تنقید میں فنی طور پر معائب میں شامل ہے۔ ایک اعتبار سے تذکرہ نویسوں کا ہمدردانہ رویّہ اس عہد کی ضرورت کے لحاظ سے مناسب تھا لیکن دورِ حاضر میں تنقیدی اصول اس کی منافی کرتے ہیں یہ ایک حقیقت ہے کہ دکنی تذکرے جس دور کے نمائندہ ہیں اس وقت تنقیدی اصول کارفرما نہیں تھے۔ بلکہ ہر تذکرہ نویس اپنے مزاج کی مطابقت کا لحاظ

---

[۱] فن کی جانچ از ڈاکٹر سیدہ جعفر ص ۱۷۴ مطبوعہ حیدرآباد ۱۹۶۵ء

کرتے ہوئے تذکرہ کرتا تھا جس کے نتیجہ میں دکنی تذکرے ہمدردانہ رویئے سے منسلک ہوگئے۔

۴۔ مشکوک حوالے و ماخذات :

دکنی تذکروں کی اہمیت و افادیت کا جائزہ لیتے وقت جب ان کے محاسن اور معائب پر غور کیا جاتا ہے تو یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ جہاں دکنی تذکرے محاسن کی نمائندگی کرتے ہیں وہیں معائب کا اظہار بھی ہوتا ہے

دکنی تذکروں کے معائب میں مشکوک حوالے بھی شامل ہیں۔ عام طور پر تذکرہ نویس ترتیب و تدوین تذکرہ کے دوران اس بات کو ملحوظ نہیں رکھتے کہ ان کے حوالے فنی طور پر تشکیک پر مبنی ہیں۔ یعنی تذکرہ نویس شاعروں کی زندگی کے حالات اور واقعات کے بیان کے دوران کسی ٹھوس ثبوت کا سہارا نہیں لیتا اور نہ ہی کسی ایسے اہم حوالہ کی دلیل پیش کرتا ہے کہ جس کی وجہ سے شاعر کے بارے میں پیش کردہ متن میں شک کی گنجائش نہ رہے بلکہ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ تذکرہ نویس سینہ بہ سینہ منتقل ہونے والے علم کے معترف تھے جس کے نتیجہ میں انھوں نے صرف انہی باتوں کو ضبط تحریر میں لایا جو بطور روایت چلے آرہے تھے اور جن کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں تھا۔ تذکروں میں اس قسم کا عمل اختیار کرنا مشکوک حوالہ سے تعبیر کیا جاتا ہے جس میں تذکرہ نگار تساہل یا بے اعتنائی کی وجہ سے چند ایسے بے سروپا حوالے رقم کر دیتا ہے جن کی حقیقت پر شک و شبہ کی گنجائش پیدا ہوجاتی ہے۔ دکنی تذکروں میں مشکوک حوالے اور ماخذات کا عمل دخل ہندوستان کے تمام تذکروں میں موجود ہے۔ اس خصوص میں ڈاکٹر حنیف نقوی لکھتے ہیں۔

"اس زمانے میں نہ تو ولادت و وفات اور دوسرے واقعات کی تاریخیں محفوظ رکھنے کی روایت موجود تھی اور نہ ہر شخص کے بارے میں اس قسم کی معلومات فراہم کرنا عملاً ممکن تھا۔ اس لیے تذکرہ نگار ایک زمانے

تک اس طرح کے حوالوں کو غیر ضروری خیال کرتے رہے"۔ ۵ؔ

دکنی تذکروں میں حوالوں کی تشکیک اسی وجہ سے دکھائی دیتی ہے کہ تذکرہ نویسوں نے اپنے عہد کی روایت کے مطابق تذکرے لکھے۔ جس کی وجہ سے ان تذکروں میں حوالوں کا ذکر کمیاب ہے۔ اسی طرح تذکروں میں ماخذات کا عمل بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ بعض اوقات یہی ماخذات تذکروں کی اہمیت کو بڑھا دیتے ہیں۔ اس خصوص میں حوالے، اقتباسات اور ماخذات کی ضرورت کو تذکروں میں واضح کرتے ہوئے ڈاکٹر حنیف نقوی لکھتے ہیں۔

"تذکروں میں کبھی کبھی ایسی کتابوں کے حوالے اور اقتباسات بھی مل جاتے ہیں جو یقینی طور پر فنا ہو چکی ہیں یا جن کی بازیابی کے امکانات مفقود ہیں"۔ ۶ؔ

دکنی تذکروں میں "گل عجائب" "تحفۃ الشعراء" ریاض حسنی، گلشن گفتار" اور دیگر تذکروں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں بعض ایسے ماخذات بھی درج کیے گئے ہیں۔ جن کی وجہ سے بعض تاریخی، سماجی اور ثقافتی واقعات کی عکس کشی بھی ہوتی ہے اگرچہ ان ماخذات میں ٹھوس حقیقت کا کسی قدر فقدان نظر آتا ہے مگر ان کی اہمیت اس وجہ سے بڑھ جاتی ہے کہ دکنی تذکروں کے علاوہ اور کسی کتاب میں ان کا ذکر نہیں ملتا۔ جس سے ثبوت ملتا ہے کہ دکنی تذکرے اپنے عہد کی تصویر کشی کی جانب راغب تھے۔ دلی اورنگ آبادی کے حالات اور دکن میں شاعروں کی چشمکوں کے بارے میں اگر کسی کتاب میں مواد دستیاب ہو سکتا ہے تو وہ صرف تذکرے ہیں۔ بلکہ بعض دکنی تذکروں سے ایسے ماخذات بھی مل جاتے ہیں یا جن سے مختلف علاقوں کی ادبی سرگرمیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ تاریخ کی کتابیں اس قسم کے متن کی پیش کشی میں پیچھے تھیں۔ اسی لیے تذکروں کی اہمیت و افادیت کے دوران ادبی تاریخ کے ساتھ ساتھ سماجی زندگی میں ادب اور شاعری کے عمل و دخل کو ثابت کرنے کے لیے

۶ؔ شعرائے اردو کے تذکرے از ڈاکٹر حنیف نقوی صفحہ ۱۴۳ مطبوعہ سنہ ۱۹۷۶ء،

تذکرے مسلّم ثبوت کا درجہ رکھتے ہیں جس سے کوئی بھی ادب کا طالبِ علم منکر نہیں ہو سکتا۔ دکنی تذکروں کی اہمیت و افادیت کو واضح کرتے ہوئے پروفیسر سیّد محمد محاکمانہ انداز میں لکھتے ہیں۔

"شعرائے دکن کی نسبت تذکروں کی ناقص معلومات کے مدّنظر گلشن گفتار کی اطلاعات اس لحاظ سے کہ اس کا مؤلف خود دکن کا باشندہ تھا اور اکثر دکنی شاعروں سے شخصی طور پر واقف تھا، زیادہ مستند و معتبر ہیں اور جن دکنی شاعروں کا ذکر دوسرے تذکروں میں قطعاً مفقود ہے ان کے متعلق اس تذکرہ کے بیانات سے اہلِ تحقیق کو بڑی مدد مل سکتی ہے"[1]

مجموعی اعتبار سے دکنی تذکرے اس وجہ سے اہمیت و افادیت کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ ان کے ذریعہ دکن میں شعر و ادب کی روش اور یہاں کی ادبی سرگرمیوں سے واقفیت ہوتی ہے اس کے علاوہ دکنی تذکرے تنقیدی اشاروں کے ذریعہ اپنے عہد کی تاریخ اور زبان کی نشاندہی کرتے ہیں۔ دکن میں تحریر کردہ تمام تذکروں میں شاعری کے ارتقاء کا واضح خاکہ نظر آتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تذکروں کا معیار بھی ابتداء سے ارتقاء کے مراحل طے کر کے ایک خاص نتائج پر مرکوز ہو جاتا ہے۔ محاسن اور معائب کے پس منظر میں دکنی تذکرے اپنے دور کی یادگار ہیں جن کے ذریعہ سماج کے اس تخلیق کار طبقہ کی نمائندگی ہوتی ہے جو ادب کی دنیا میں شاعر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ دکن کے تمام تذکرے شاعروں کی زندگی کے حالات اور ان کا منتخب کلام پیش کر کے دکنی ادب کی تاریخ کو فنِ تذکرہ کی روایت سے مربوط کرتے ہیں جو موجودہ تحقیق کے لحاظ سے اردو کی پہلی صنف نثر ہے۔

---

[1] مقدمہ گلشنِ گفتار ص ۹، ۸ از خواجہ حمید الدین اورنگ آبادی۔ مرتبہ پروفیسر سید محمد۔ مطبوعہ خورشید پریس حیدرآباد دکن ۱۹۳۰ء۔

کتابیات

فہرستِ ماخذات

قلمی

۱۔ بہارستانِ سخن	میر عبدالرزاق حسینی	اسٹیٹ سنٹرل لائبریری ۱۱۷۲ھ
۲۔ تذکرۂ جوہرِ فرد	سید محمد علی ملیح آبادی	عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری ۱۹۰۹ء
۳۔ تذکرۂ خوش نویساں	مرزا محمد علی	سالار جنگ میوزیم لائبریری 1323ھ
۴۔ تحفۃ الکرام	ـ	ـ ـ
۵۔ جمعاتِ شاہیہ	ـ	انجمن ترقی اردو۔ کراچی ـ
۶۔ دستور الشعرا دو خزینۃ الامثال	شمس الدین فیض	اسٹیٹ سنٹرل لائبریری ـ
۷۔ تذکرہ کامل عیار ترجمہ معیار الاشعار	مظفر علی خاں احمر	" "
۸۔ سلسلہ مشائخ طریقت	فدا علی زرویش	عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری ـ
۹۔ شجرۃ المحمود	محمد منیر الدین چشتی محمود	اسٹیٹ سنٹرل لائبریری 1303ھ
۱۰۔ شجرۃ الانساب	گردھاری پرشاد باقی	عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری 1327ھ
۱۱۔ کشکول	فرید الدین خاں خویشگی	سالار جنگ میوزیم لائبریری 1327ھ

بیاض و سلاسل کے نمائندہ تذکرے

۱۔ بیاض اشعار شعرائے دکن	بتوسط سید ابراہیم یداللّٰہی	عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری	۔
۲۔ حکایات الشعراء	مرزا ابوالفضل عباسی	اسٹیٹ سنٹرل لائبریری	سنہ ۱۳۱۰ھ
۳۔ رسالۂ احوال پیغمبراں	۔	عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری	۔
۴۔ رموز العارفین	ایمن	״ ״	۔
۵۔ سلسلۂ مشائخ طریقت	فدا علی درویش	״ ״	۔
۶۔ سلک جواہر	محمد فخر الدین حسینی	״ ״	۔
۷۔ مقصود السالکین	سید جلال الدین اکمل	״ ״	۔

دکن میں مطبوعہ تذکروں کی فہرست

نام کتاب	نام مؤلف	مطبع	سنہ تالیف
۱۔ آثار الشعراء	سید محمد ممتاز علی	–	–
۲۔ احوال العارفین	محمد نعیم مسکین شاہ	مطبع فیض الکریم حیدرآباد	سنہ ١٣١٧ھ
۳۔ اخبار الصالحین حصہ اول	معشوق یار جنگ	اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد	سنہ ١٣٥٢ھ
۴۔ انوار جلالی	سید شاہ محمد حسینی	〃 〃	–
۵۔ باغ دلکشا	صمصام شیرازی	مشیر عالم 〃	سنہ ١٣٥٨ھ
۶۔ بیاض سخن	عبدالشکور شیدا	زندہ طلسمات 〃	سنہ ١٣٥٥ھ
۷۔ تذکرہ	ریاست علی چشتی		سنہ ١٩٢٦ء
۸۔ تذکرہ اصفیا	ابوالخیر کنج نشین	صحیفہ 〃	سنہ ١٣٧٤ء
۹۔ تذکرۂ آصفیہ	ابوالخیر شاہ	حیدرآباد	
۱۰۔ تذکرۂ اطبائے عہد عثمانی	حکیم شفاء	〃	سنہ ١٩٥٢ء
۱۱۔ تذکرۃ الاولیاء	محمد حسام الدین	〃	
۱۲۔ تذکرۃ الاولیاء	قلندر حسین اطہر	مدراس	
۱۳۔ تذکرۃ الاولیاء	شیخ فرید الدین	〃	

۱۴۔ تذکرۃ الاولیاء	محمد عبدالحی	مطبع مخزن الاخبار	سنہ ۱۹۰۰ء
۱۵۔ تذکرۂ اولیائے ابوالعلائیہ	میر کاظم علی خاں	حیدرآباد	سنہ ۱۳۷۲ھ
۱۶۔ تذکرہ اولیائے حیدرآباد جلد اول و دوم	سید مراد علی طالع		
۱۷۔ تذکرۂ اولیائے رائچور	سید شاہ روشن علی قادری		
۱۸۔ تذکرۂ باب حکومت	محمد مظاہر	حیدرآباد	
۱۹۔ تذکرہ بابا شرف الدین	رشید بادشا	حیدرآباد	
۲۰۔ تذکرہ بابر	محمد حبیب الرحمٰن خان	حیدرآباد	سنہ ۱۳۴۵ھ
۲۱۔ تذکرہ تیموریہ	احمد شفیع	"	
۲۲۔ تذکرہ جمیل	محمد عبدالرزاق بسمل	"	
۲۳۔ تذکرۂ حسن	محمد حسام الدین فاضل	"	سنہ ۱۳۵۳ھ
۲۴۔ تذکرہ حسین	"	"	سنہ ۱۳۵۳ھ
۲۵۔ تذکرہ حضرت جلال الدین	سخاوت مرزا	"	سنہ ۱۹۶۲ء
۲۶۔ تذکرہ حضرت سید شاہ اسمٰعیل قادری	محمد معین الدین اختر	"	سنہ ۱۹۷۵ء
۲۷۔ تذکرہ حمید الدین چشتی	ریاضت علی چشتی	"	سنہ ۱۹۶۶ء
۲۸۔ تذکرہ خاصانِ خدا	مصطفائی بیگم	اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد	سنہ ۱۹۴۰ء
۲۹۔ تذکرۃ الخطابیہ	محمد عثمان عمادی	حیدرآباد	سنہ ۱۹۳۵ء
۳۰۔ تذکرۂ خواتین دکن	محمد الدین فوق	لاہور	سنہ ۱۹۳۰ء
۳۱۔ تذکرہ خواجہ عبداللہ خاں	سید محمد اکرام الدین خاں	حیدرآباد	سنہ ۱۳۶۲ھ
۳۲۔ تذکرۂ دارالعلوم	نصیر الدین ہاشمی	"	سنہ ۱۳۶۲ھ

۳۳- تذکرۂ ذاکرین۔	محمد علی خاں	میر عالم پریس حیدرآباد	سنہ ۱۳۶۱ف
۳۴- تذکرہ ریختی	سید تمکین کاظمی	حیدرآباد	سنہ ۱۹۳۰ء
۳۵- تذکرہ ریختہ گویاں	سید فتح علی حسینی گردیزی	انجمن ترقی اردو اورنگ آباد	سنہ ۱۹۳۴ء
۳۶- تذکرۂ زیبا	سید محمد تقی	شمس المطابع حیدرآباد	سنہ ۱۹۳۷ء
۳۷- تذکرۂ سادات	سید شاہ ناصر الدین قادری	حیدرآباد	-
۳۸- تذکرۂ سعید	محمد افضل اقبال	؍؍	سنہ ۱۹۷۳ء
۳۹- تذکرۂ شعبۂ قانون	عثمانیہ یونیورسٹی بزم قانون	عثمانیہ یونیورسٹی پریس حیدرآباد	سنہ ۱۹۴۴ء
۴۰- تذکرۂ شعرائے اورنگ آباد	محمد سردار علی	حیدرآباد	
۴۱- تذکرۂ طاعون	محمود صمدانی	؍؍	سنہ ۱۳۳۰ھ
۴۲- تذکرۂ عثمان	محمد حسام الدین فاضل	اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد	سنہ ۱۳۵۷ھ
۴۳- تذکرۂ علی	محمد حسام الدین فاضل	حیدرآباد	سنہ ۱۳۵۶ء
۴۴- تذکرۂ غوث الدکن	محمد تاج الدین	؍؍	
۴۵- تذکرۂ قادریہ	محمد عبد القادر	؍؍	سنہ ۱۲۸۶ف
۴۶- تذکرۂ گل رعنا	لچھمی نارائن شفیق	حیدرآباد	
۴۷- تذکرۂ گلشن گفتار	خواجہ خاں حمید اورنگ آبادی	خورشید پریس حیدرآباد	سنہ ۱۳۳۹ء
۴۸- تذکرہ مخدوم زادۂ بزرگ	ابو الحسن سید عظمت اللہ حسینی	حیدرآباد	
۴۹- تذکرۂ ملازمت	محمد تراب علی	مشیر دکن پریس حیدرآباد	سنہ ۱۳۱۹ف
۵۰- تذکرۂ ملا عبد القیوم	محمد مرتضیٰ	تاج پریس حیدرآباد	سنہ ۱۹۴۵ء
۵۱- تذکرۂ مولوی محمد مرتضیٰ	نصیر الدین ہاشمی	شرکت دراسات دکن	سنہ ۱۹۴۵ء
۵۲- تذکرہ مدنی	محمد مظہر اللہ	مدراس	
۵۳- تذکرۂ نزل	محمد امام الدین	حیدرآباد	

۵۵۔ تذکرۃ النعمان	سید شاہ محمد عبدالقدوس	بنگلور	سنہ ۱۳۲۵ھ
۵۶۔ تذکرۂ یورپین شعرائے اردو	محمد سردار علی	رزاقی مشین پریس حیدرآباد	سنہ ۱۹۳۴ء
۵۷۔ چمنستانِ شعراء	لالہ لچھمی نارائن شفیق	انجمن ترقی اردو اورنگ آباد	سنہ ۱۹۲۸ء
۵۸۔ چہار چمن		مطبع معین الاسلام حیدرآباد	
۵۹۔ حالاتِ بزرگانِ سلسلہ عالیہ نقشبندیہ	محمد شمس الدین	شمس الاسلام پریس حیدرآباد	سنہ ۱۳۵۱ھ
۶۰۔ روضہ شریف	مہاراجہ سرکشن پرشاد	محبوب پریس حیدرآباد	
۶۱۔ روضۃ الاقطاب	رونق علی	دلگداز پریس لکھنؤ	
۶۲۔ روضۃ المشائخ	علی الدین انصاری	افضل برقی پریس حیدرآباد	سنہ ۱۳۵۵ء
۶۳۔ سخنورانِ بلند فکر	محمد منور گوہر	جے۔ جے پریس مدراس	سنہ ۱۹۳۷ء
۶۴۔ شہ میری اولیاء	حکیم محمود بخاری	بزم آستانہ شہ میریہ کڑپہ	سنہ ۱۹۵۸ء
۶۵۔ قصص العلماء حصہ اول تا چہارم	میرزا در علی رعد	مطبع حیدری حیدرآباد	
۶۶۔ گلدستۂ صابریہ	نور احمد انصاری گنگوہی	مطبع حیدری۔ حیدرآباد	سنہ ۱۳۰۲ھ
۶۷۔ گلِ عجائب	اسد علی خاں تمنا	انجمن ترقی اردو حیدرآباد	سنہ ۱۹۳۶ء
۶۸۔ محبوب فی المنن تذکرہ اولیائے دکن	عبدالجبار ملکاپوری۔	حسن پریس حیدرآباد	سنہ ۱۹۰۰ء
۶۹۔ محبوب الزمن تذکرۂ شعرائے دکن		مطبع رحمانی حیدرآباد	سنہ ۱۳۲۹ھ
۷۰۔ مخزن نکات	شیخ قیام الدین قائم	مطبع انجمن ترقی اردو اورنگ آباد	سنہ ۱۹۲۹ء
۷۱۔ مختصر سرگذشت سررشتہ ٹپہ	سررشتہ ٹپہ سرکار عالی	مطبع ٹپہ حیدرآباد	
۷۲۔ ہشت گلزار	قاضی الملک صبغت اللہ مدراسی	مدرسۂ شرقیہ مدراس	سنہ ۱۲۷۰ھ
۷۳۔ یادگار ضیغم	محمد عبداللہ خاں	مطبع گلزارِ دکن حیدرآباد	سنہ ۱۳۰۳ھ

غیر مطبوعہ دکنی تذکروں کی فہرست

نام کتاب	مولف کا نام	کتب خانہ کا نام	سنہ تالیف
۱۔ آثار الاوثان	سید محمد محی الدین خاں	سالار جنگ میوزیم لائبریری	مابعد سنہ ۱۱[illegible]
۲۔ تذکرہ جوہر فرد	سید محمد علی ملیح آبادی	عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری	سنہ ۱۹۰۹ھ
۳۔ تذکرۂ خاندان نواب نعمت الملک	حکیم شمس اللہ قادری	سالار جنگ میوزیم لائبریری	سنہ ۱۹۳۷ء
۴۔ تذکرہ خوش نویساں	مرزا محمد علی	سالار جنگ میوزیم لائبریری	سنہ ۱۳۲۳ھ
۵۔ تذکرۂ شعرا	شیخ محمد علی حزیں	ادارہ ادبیات اردو لائبریری	سنہ ۱۱۶۵ھ
۶۔ تذکرۂ طوطیان ہند	مولانا تمکین کاظمی	ادارۂ ادبیات اردو لائبریری	سنہ ۱۹۳۶ء
۷۔ تذکرہ عطائے تمکین	—	ادارۂ ادبیات اردو لائبریری	سنہ ۱۲۹۲ھ
۸۔ ریاض حسنی	عنایت اللہ فتوت	سنٹرل ریکارڈ آفس حیدرآباد	سنہ ۱۱۰۳ھ
۹۔ شجرۃ المحمود	محمد منیر الدین چشتی	اسٹیٹ سنٹرل لائبریری	سنہ ۱۳۰۳ھ
۱۰۔ شجرۃ الانساب	گردھاری پرشاد باقی	عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری	سنہ ۱۳۰۹ھ
۱۱۔ کشکول	فرید الدین خاں خویشگی	سالار جنگ میوزیم لائبریری	سنہ ۱۳۲۷ھ

۱۲۔ گلدستہ گفتار | شیر محمد خاں | اسٹیٹ سنٹرل لائبریری

۱۳۔ ملفوظات حضرت سید محمد جونپوری | — | انجمن ترقی اردو پاکستان

۱۴۔ ید بیضا | غلام علی آزاد بلگرامی | سالار جنگ میوزیم لائبریری

فہرست ماخذات

سنہ تالیف	مطبع	مصنف	نام کتاب
		سر سید احمد خاں	۱۔ آثار الصنادید
1317ھ	مطبع فیض الکریم حیدرآباد	محمد نعیم سکین شاہ	۲۔ احوال العارفین
1352	اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد	معشوق یار جنگ	۳۔ اخبار الصالحین
		ڈاکٹر یوسف حسین خاں	4۔ اردو غزل
1925ء	تاج پریس حیدرآباد	حکیم شمس اللہ قادری	5۔ اردوئے قدیم
1961ء	گلڈ پبلشنگ ہاؤس کراچی	سید شاہ علی	6۔ اردو میں سوانح نگاری
	مملوکہ افسر صدیقی پاکستان	وجیہ الدین گجراتی	7۔ بحر الحقائق
1977ء	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔ دہلی	ڈاکٹر جمیل جالبی	8۔ تاریخ ادب اردو
1925ء	البلاغ پریس کلکتہ	مولانا ابوالکلام آزاد	9۔ تذکرہ
1939ء	مکتبہ ابراہیمیہ۔ حیدرآباد	عبد المجید صدیقی	10۔ تذکرہ اعظم الامراء ارسطو جاہ
1345ء	مطبع اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد	محمد حبیب الرحمن خاں شیروانی	11۔ تذکرہ بابر
"	"	محمد حسام الدین	12۔ تذکرہ تاریخ الاولیاء
1955ء	شمس المطابع پریس حیدرآباد	احمد شفیع	13۔ تذکرہ تیموریہ

14- تذکرۂ چمنستان شعراء	رقیہ عطا کاکوی	آرٹ پریس سلطان گنج پٹنہ	1969ء
15- تذکرۂ حسن	محمد حسام الدین فاضل	اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد	13 583ء
16- تذکرۂ حسین	〃	〃	〃
17- تذکرۂ حضرت جلال الدین	سخاوت مرزا	〃	1962ء
18- تذکرۃ الخطابہ	محمد عثمان عمادی	〃	
19- تذکرۂ جمیل	محمد عبدالرزاق بسمل	شمس الاسلام 〃	1925ء
20- تذکرۂ حمید الدین ناگوری	ریاضت علی چشتی	〃 〃	1966ء
21- تذکرۂ خاصان خدا	مصطفائی بیگم	اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد	1940ء
22- تذکرۂ خواتین دکن	محمد الدین فوق	لاہور	1920ء
23- تذکرہ خواجہ عبداللہ خاں	سید محمد اکرام الدین	حیدرآباد	1392ھ
24- تذکرہ دار العلوم	نصیر الدین ہاشمی	شمس المطابع حیدرآباد	1362ھ
25- تذکرۂ ذاکرین	محمد علی خاں	مشیر عالم پریس 〃	1361ھ
26- تذکرۂ زیبا	سید شرف الدین	شمس المطابع 〃	1345ھ
27- تذکرۂ سادات	ناصر الدین علی قادری	حیدرآباد	-
28- تذکرۂ سعید	محمد افضل اقبال	سعیدیہ لائبریری حیدرآباد	1973ء
29- تذکرۂ شعبہ قانون	مرتبہ قانون عثمانیہ یونیورسٹی	حیدرآباد	1944ء
30- تذکرۂ شعرائے اورنگ آباد	محمد سردار علی	کتب خانہ میر جوگ حیدرآباد	-
31- تذکرۂ شعرائے دکن	عبدالجبار ملکاپوری	مطبع رحمٰن حیدرآباد	1329ھ
32- تذکرۂ طاعون	محمود حمدان	حیدرآباد	1323ھ
33- تذکرہ علی	محمد حسام الدین فاضل	〃	-
34- تذکرۂ غوث دکن	محمد تاج الدین	〃	1386ھ